قانونِ اسلامی ۔ اختصاصی مطالعہ ۵

اصولِ فقہ

سنّت کی حجّیت کا جائزہ

شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

قانونِ اسلامی-اختصاصی مطالعہ
اصولِ فقہ---۵
مصادرِ اصلیہ---۳

سنّت کی حجّیت کا جائزہ

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

قانونِ اسلامی - اختصاصی مطالعہ

اصولِ فقہ---۵

مصادرِ اصلیہ-۳

عنوان	:	سنت کی حجیت کا جائزہ
مؤلف	:	ڈاکٹر محمد سعد صدیقی
نظرِثانی	:	پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
ادارت	:	عرفان خالد ڈھلوں
حتمی تصحیح	:	شہزاد اقبال شام
نگران مطالعہ اسلامی قانون کورس	:	شہزاد اقبال شام
نگران منشورات	:	سیّد عبدالرحمان بخاری
ناشر	:	شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
مطبع	:	مارشل پرنٹنگ پریس چک بازار صدر راولپنڈی فون: ۵۵۶۳۹۰۱
سالِ طباعت	:	۲۰۰۲ء
تعداد	:	

ISBN 969-8263-16-0

فہرست

پیش لفظ

کسی ریاست کا رائج قانون اس میں بسنے والوں کے اساسی نظریات و عقائد کا عکاس ہوتا ہے ورنہ قانون اور قوم میں اجنبیت کے باعث نہ تو قانون اس قوم میں قبولیت عام کی سند حاصل کرتا ہے اور نہ قوم اس قانون کے احترام اور پاسداری میں گرمجوشی کا مظاہرہ کرتی ہے جس کا نتیجہ معاشرتی انتشار و انتشار اور بے چینی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر قانون اجنبی اور مسلط کردہ ہو تو اس پر عمل جبر کے تحت ہوتا ہے اور مجبور قومیں آزاد نہیں ہوتیں۔ اجنبی قانون تو وہ قومیں اپناتی ہیں جو خود کسی دستور اور نظمِ قانون سے تہی دامن ہوتی ہیں۔

مسلم اُمہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ دستور سازی اور قانون سازی پر اس کا علمی ورثہ بہت گراں قدر ہے۔ گذشتہ ۱۳ صدیوں سے مسلمان اہلِ علم کی تحریریں قانون اور اصول قانون پر دنیا بھر کی رہنمائی کر رہی ہیں۔ امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ)، امام محمد شیبانیؒ (م ۱۸۹ھ) اور امام شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) کی کتابیں آج بھی روشنی کا منبع ہیں۔

امت مسلمہ کے قانونی اور دستوری نظام کے دو بنیادی عناصر ہیں جن کے بغیر اسلام کا قانونی نظام نہ تو اپنی صحیح شکل و صورت میں قائم رہتا ہے اور نہ ان سے فکری غذا حاصل کیے بغیر ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ پہلا بنیادی عنصر اسلامی عقائد ہیں جن کی وجہ سے اہلِ ایمان میں فکری استحکام پیدا ہوتا ہے۔ یہ فکری استحکام ایمان و یقین کی وجہ سے اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ صاحبِ ایمان کو ہر قسم کی فکری بے راہ روی سے محفوظ کر کے حق و صداقت کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ دوسرا بنیادی عنصر اخلاق و تزکیہ ہے۔ مکارمِ اخلاق کی تعلیم اور تزکیۂ نفس انسان کے کردار، مزاج اور رویہ کی اصلاح کر کے اسے معاشرہ میں تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ مقام پر فائز رکھتے ہیں۔

امت مسلمہ جب تک اپنے فقہی اور قانونی ورثہ سے وابستہ رہی اس وقت تک اس کی ترقی کی رفتار بھی تیز رہی اور عالمی قیادت میں بھی اس کا نمایاں کردار رہا اور دنیا بھر کے انسانوں کی رہنمائی کے لیے بہترین نمونہ بھی پیش کرتی رہی۔

لیکن جب مسلمانوں میں بنیادی عقائد کی تعلیم و تربیت کا نظام کمزور پڑ گیا اور اخلاقی اقدار میں ضعف پیدا ہوا تو اس کے اثرات مسلمانوں کی سیاسی، اجتماعی اور قانونی زندگی پر بھی مرتب ہوئے۔ پھر استعماری دور میں اسلامی روایات، نظامِ تعلیم، قانون اور تہذیب و تمدن کو مٹانے کے لیے منظم کوششیں کی گئیں جس کے نتیجے میں برصغیر میں ملک کے اسلامی عدالتی اور تعلیمی نظام کی جگہ استعمار کے اپنے نظام نے لے لی۔ اس صورتِ حال نے اس پورے خطہ کو بری طرح متاثر کیا اور بتدریج ہر شعبہ میں شر و فساد سرایت کرتا چلا گیا جس کے تباہ کن اثرات سے آج ہم دوچار ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ نے برحق فرمایا تھا:

نَحْنُ قَوْمٌ اَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ، وَاِنِ ابْتَغَيْنَا الْعِزَّةَ بِغَيْرِهِ اَذَلَّنَا اللّٰهُ

ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ عزت بخشی، اگر ہم نے عزت کو اسلام کے علاوہ کسی اور نظامِ حیات میں تلاش کیا تو اللہ ہم کو ذلیل کر دے گا۔

لیکن آج مسلمانوں میں موجودہ صورت حال کو تبدیل کرنے کی تڑپ پائی جاتی ہے وہ چاہتے ہیں کہ غیر اقوام کے قانون سے خود کو آزاد کرا کے قرآن و سنت کے نظام حیات میں دوبارہ عزت تلاش کریں۔ اسی تڑپ کے وہ مظاہر ہیں جو دنیا کے مختلف خطوں میں عالم اسلام اور عالم کفر کے مابین کشمکش کی صورت میں نظر آ رہے ہیں۔

امت مسلمہ کو ایسے رجال کار کی ضرورت ہے جن کی جدید قانونی نظریات پر تنقیدی نظر ہو اور جو فقہ اسلامی کے اصل ماخذ سے استفادہ کرنے کی دسترس رکھتے ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا احکام شریعت کی اکملیت، حقانیت اور ان کے قابل عمل ہونے پر غیر متزلزل ایمان ہو، ان احکام کو روبہ عمل دیکھنے کی حقیقی تمنا اور لگن بھی ہو۔

ایسے رجال کار کی تیاری میں شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد بھی اپنے قیام کے روز اول سے مصروف عمل ہے۔ اس کام میں بیرون ملک کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی قانون دان طبقوں کے تربیتی پروگراموں کے انعقاد مسلسل جاری ہے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کے شعبہ میں فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر "سلسلہ مباحث فقہیہ" کی تیاری اور اردو اور انگریزی زبانوں میں تراجم کا کام بھی ہو رہا ہے۔ شریعہ اکیڈمی کے تحت "مطالعہ اسلامی قانون" پر ایک ابتدائی کورس کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس ایک سالہ فاصلاتی کورس کے ذریعے اندرون اور بیرون ملک ہزاروں افراد اسلامی قانون کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔

ہم نے اس ابتدائی کورس کے آغاز پر اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر "ایڈوانس کورسز" تیار کیے جا رہے ہیں اور جلد ہی ان کو شروع کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے ہمارے عزم کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت بخشا، ہماری راہیں آسان فرمائیں اور ہم اس قابل ہوئے کہ اصول فقہ (ISLAMIC JURISPRUDENCE) میں اختصاصی مطالعہ (ADVANCE COURSE) کا اجراء کر سکیں۔ فاصلاتی نظام کے تحت یہ اختصاصی مطالعہ چوبیس درسی اکائیوں (UNITS) پر مشتمل اور ایک سالہ دورانیہ پر محیط ہے۔

اسلامی قانون میں دیگر اختصاصی مطالعہ جات کی تیاری کا کام جاری ہے ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ اس نے جس طرح ہمیں اصول فقہ میں اس اختصاصی مطالعہ کو شروع کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے، اسی طرح ہمارے دیگر منصوبوں کی تکمیل میں بھی نصرت الٰہی شامل حال رہے۔ ان شاء اللہ

پاکستان بلکہ پوری ملت اسلامیہ پر قانون الٰہی کے غلبہ و قیادت کے مطلوبہ رجال کار کی تیاری کسی ایک ادارے کا کام نہیں ہے بلکہ اس میں امت مسلمہ کے ہر فرد کو اپنی حیثیت کے مطابق کردار ادا کرنا ہے۔

ہم اہل علم سے ایسی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے جو ہمارے منصوبوں کی بہتری میں ممد و معاون ہوں۔

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

تعارف

گذشتہ درسی اکائی (UNIT) میں سنت کی تعریف، اقسام، اس کی استنادی حیثیت اور بطور بنیادی مصدر احکام اس کی تشریعی حیثیت کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ زیر نظر اکائی میں سنت کی حجیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جائزہ لینے کا یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ سنت کی حجیت بیان کی جائے اور قرآن مجید اور احادیث میں سنت کی حجیت کے جو اصول بیان ہوئے ہیں، ان کی وضاحت کر دی جائے۔

سنت کی حجیت پر بحث یوں تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے کسی پیغمبر کے مومن ہونے پر دلائل دے، لیکن چونکہ سنت ماخذ قانون کی حیثیت میں فقہاء کی بحثوں کا مدار ہی نہیں رہا بلکہ کتب فقہ میں یہ ایک مستقل بحث کے طور پر شامل رہا ہے اس لیے علمی اعتبار سے اس سے متعلقہ عنوانات اس درسی اکائی میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس درسی اکائی کا مقصد یہ ہے کہ سنت کی حجیت پر قرآنی و نبوی دلائل سے آپ آگاہ ہو جائیں۔ سنت کے بحیثیت بنیادی مصدر احکام اور حجت ہونے پر آپ کا ایمان مزید مضبوط ہو جائے اور سنت کی حجیت پر آپ کو شرح صدر ہو جائے۔

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سنت کی حجیت کا جائزہ

اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کی فطرت اس طرح تشکیل دی ہے کہ وہ اپنی ہدایت اور راہنمائی کے لیے کتاب و ہدایت کے ساتھ عملی نمونہ کا خواہاں رہتا ہے، اسی مقصد کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کے لیے بھی اولادِ آدم ہی کو منتخب کیا کہ آدم کی اولاد کے لیے بہترین نمونۂ عمل اپنے ابنائے جنس سے ہی ممکن ہے۔ انسان کے لیے جنات ہدایت کا سامان بن سکتے ہیں، نہ حیوانات بلکہ فرشتے جو معصومیت میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، جن کا وظیفۂ حیات صرف اور صرف اللہ کی تسبیح و تحمید ہے، وہ بھی انسانوں کی ہدایت کے لیے نمونہ نہیں بن سکتے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل تھی کہ وہ فرشتوں کو اپنا رسول بنا کر بھیج دیتا لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ انسانوں میں سے پیغمبر مبعوث کیے جائیں۔ ارشاد ہوا:

لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا [الأسراء ١٧:٩٥]

اگر زمین میں فرشتے رہتے ہوئے، اس میں چلتے پھرتے تو پھر ہم ان پر آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے۔

یعنی اگر زمین پر انسانوں کے بجائے فرشتے آباد ہوتے اور ان کی ہدایت مطلوب ہوتی تو یقینا فرشتوں ہی کو نبی بنا کر بھیجا جاتا لیکن زمین پر انسان آباد ہیں اور ہدایت بھی انہی کی مطلوب ہے۔ ان کی ہدایت اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایک انسان اللہ کی طرف سے پیغامِ ہدایت اور مکمل عملی نمونہ لے کر آئے اور باقی تمام انسان اس پیغامِ ہدایت اور اس عملی نمونہ کی پیروی کریں تاکہ فلاح و کامیابی اور ہدایت کی منزل حاصل کرنے والے ہوں۔ یہ مطلوب صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب انسانوں ہی میں سے نبی اور رسول بنا کر بھیجے جائیں۔

مزید یہ کہ اللہ کے ان انبیاء علیہم السلام کی بعثت محض اس پیغام کو اُمت تک پہنچانے اور اس کتاب کو اُمت کے سامنے تلاوت کر دینے تک محدود نہ ہو بلکہ ان کی زندگی کا ایک ایک گوشہ، حیاتِ مبارکہ کا ایک ایک لمحہ، کتاب ہدایت کا عملی پیکر اور اُمت کے لیے مجسم نمونہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے جس قدر بھی انبیاء علیہم السلام آئے، سب نے توحید و الوہیت کے اقرار و ایمان کو اپنی اتباع اور پیروی کی بنیاد بنایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا [مریم ١٩:٤٣]

اے میرے باپ میرے پاس ایسا علم ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے تو تم صرف میرے کہنے پر چلو، تم کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے فرمایا:

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۗ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى [طٰہٰ ۲۰:۴۷]

ہم تیرے پاس تیرے رب کی جانب سے نبوت کا نشان لائے ہیں، اور ایسے شخص کے لیے سلامتی ہے جو سیدھی راہ پر چلے۔

یعنی جو سامانِ ہدایت ہم لائے ہیں، جو اُس کی اتباع اور پیروی کرے گا، سلامتی حاصل کرنے والا ہوگا۔ اسی طرح حضرت ھود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام نے اپنی نبوت کا اعلان کرنے کے بعد اپنی اپنی اقوام کو یہی پیغام دیا کہ:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ [الشعراء ۲۶:۱۰۸] (۱)

غرضیکہ اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی پیغمبر آئے، سب نے اپنی اپنی اُمت کو اللہ کی عبادت کی طرف بلایا اور عبادت کے لیے اسی طریقہ کو اختیار کرنے کا حکم دیا جس طریق زندگی پر وہ خود عمل پیرا تھے۔

انبیاء علیہم السلام کا یہ سلسلہ اپنے کمال و معراج کو پہنچا، تربیتِ انسان اپنی انتہاء اور اپنے عروج پر پہنچنے والی ہوئی تو اللہ کے آخری پیغمبر، افضل الانبیاء امام الرسل محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ سلم اس پوری کائنات پر رحمت بنا کر بھیجے گئے۔ انبیاء سابقین کی زندگیاں صرف ان کی امت کے لیے نمونۂ عمل تھیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو ساری انسانیت کے لیے نمونۂ عمل بنایا گیا۔ انبیاء سابقین علیہم السلام کی زندگی وقت و زمانہ میں محدود تھی، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی وقت و زمانہ کی حدود سے ماورا قیامت تک کے لیے نمونۂ عمل بنا دی گئی۔ انبیاء سابقین علیہم السلام کی زندگی اور ان کی زندگی کے ایک ایک عمل بلکہ ان پر نازل ہونے والی کتاب کی بھی اللہ نے خود حفاظت نہیں کی لیکن پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب کی خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا اعلان ہوا اور پھر نہ صرف یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوی زندگی کا ایک ایک گوشہ اور ایک ایک لمحہ محفوظ کر لیا گیا بلکہ جن لوگوں نے اس کو روایت کیا، ان کی زندگیاں بھی محفوظ ہوگئیں۔ آج رجال کی کتابوں میں ہزاروں نہیں لاکھوں راویانِ حدیث کے احوال محفوظ ہیں اور یہ صرف اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا کوئی عمل نقل کرنے کی انہیں سعادت حاصل ہوئی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، آپ کا طریق عمل اور آپ کی سنّت ہمارے لیے کس طرح حجت اور قانون ہے، قرآن کریم نے اس پر کس طرح واضح ہدایات دی ہیں، اس پر ذیل میں بحث ہوگی:

سنّت کی حجیت قرآن کریم کی روشنی میں

قرآن کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی حجیت پر جن اسالیب سے بحث کی ہے انہیں حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مزید ملاحظہ ہو الشعراء کی آیات: ۱۲۶، ۱۴۴، ۱۶۳، ۱۷۹

۱۔ انسانیت کی ابتداء و انتہاء اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

قرآنی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسانیت کی ابتداء ایمان سے ہوتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اہل کفر و شرک صنفِ انسانیت سے خارج اور جانوروں کی فہرست میں داخل ہیں بلکہ از روئے قرآن وہ جانوروں سے بدتر ہیں۔ ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے کہ جو اللہ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں اور کفر و شرک کی راہ اختیار کرتے ہیں، قرآن کہتا ہے:

أُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ [الاعراف ۷:۱۷۹]

یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔

اسی طرح ایک ایسے شخص کے متعلق جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت و فرمانبرداری سے دست کش ہوکر کفر و طاغوت کی راہ اختیار کی، اس کا حکم بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا [الفرقان ۲۵:۴۴]

یہ لوگ تو جانور جیسے بلکہ ان سے بدتر ہیں

کیونکہ جانور کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ عقلیہ سے محروم رکھا، اس کو حق و باطل میں فرق و امتیاز کی اور حق کو پہچاننے کی فہم و صلاحیت اور ادراک عطا نہیں فرمایا، جبکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ عقلیہ عطا فرمائی، فہم و ادراک کی اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت فرمائیں اور اسی قوت عقلیہ کی بناء پر اسے اس بات پر مامور کر دیا کہ وہ حق کو پہچان کر اس کی پیروی کرے اور باطل کو باطل جان کر اس سے بچنے کی صلاحیت کو بروئے کار لائے۔ اگر کوئی انسان اپنی اس قوتِ عقلیہ سے جو اس کے اور ایک حیوان کے درمیان وجہ فرق و امتیاز ہے، کام نہیں لیتا اور حق کی راہ اختیار نہیں کرتا وہ نہ صرف جانوروں کی صف میں داخل ہو جائے گا بلکہ ان سے بھی بدتر ہو جائے گا کہ ایک قوت و صلاحیت کے ہوتے ہوئے بھی اسے بروئے کار نہیں لا رہا۔ معلوم ہوا کہ انسان، انسانوں کی صف میں اسی وقت داخل ہوگا جبکہ اللہ کی آیات، اس کے احکام اور فیصلوں پر ایمان لائے۔ پھر جب اس ایمان کی شرائط و احکام، اہل ایمان کی علامتیں اور نشانیاں دیکھی جائیں تو معلوم ہوگا کہ ایمان اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کی جائے بلکہ ایمان کی دولت اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی، جب تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فیصلہ، ہر قول اور ہر فعل کی اطاعت کے لیے برضا و رغبت سرِ تسلیم خم نہ کر لیا جائے۔ اس فیصلہ پر عمل کرنے میں کسی قسم کا تذبذب، شک، تردد یا عار محسوس کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک دائرۂ ایمان سے خارج ہے اور ایسا خارج ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مومن نہ ہونے کو اپنی ربوبیت کی قسم کھا کر بیان کرتا ہے کہ جس نظامِ ربوبیت کے تحت ساری کائنات کا وجود قائم ہے، جس ربوبیت کی اساس و بنیاد پر اس عالم میں ہر جاندار و بے جان شئے اپنا وجود قائم کیے ہوئے ہے۔

فَلَاوَرَبِّكَ لَايُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَايَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا [النساء ۴:۶۵]

آپ کے رب کی قسم، ایسے لوگ ہرگز مومن نہیں، جب تک یہ بات واقع نہ ہو کہ آپس

میں جو جھگڑا واقع ہو، اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں اور پھر اس تصفیہ سے
اپنے دل میں کوئی تنگی نہ پائیں اور اسے پورا پورا تسلیم کرلیں۔

معلوم ہوا کہ انسان اپنا شرف و امتیاز اسی صورت میں برقرار رکھ سکتا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بطیب خاطر اطاعت و پیروی کرے بصورتِ دیگر اپنے تشخص، دیگر مخلوقات میں اپنی برتری، اپنے شرف و امتیاز اور حتیٰ کہ اپنے لقب ''احسن تقویم'' کو بھی ختم کرنے والا ہوگا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ، ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ [التین ۹۴:۴ تا ۶]

ہم نے انسان کو بلاشبہ بہترین مخلوق بنایا اور پھر قعر مذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈال دیا
مگر اس قعر مذلت سے وہ لوگ محفوظ رہے جو ایمان لائے اللہ پر اور نیک اعمال کیے۔

حصولِ انسانیت کے لیے انسان کو ایمان اور عمل صالح کی ضرورت ہے اور ایمان کے لیے اطاعتِ رسول کی۔ ابتداء و آغاز کے بعد انجام کار اور نتیجہ اعمال کا مسئلہ ہوتا ہے، اس حوالہ سے جب ہم قرآنی تعلیمات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے انجام کار میں وہی لوگ کامیاب و کامران ہیں جو اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے والے ہیں:

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ [المائدۃ ۵:۱۱۹]

اللہ تعالیٰ ان سے راضی و خوش اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی و خوش ہیں اور یہ بڑی بھاری
کامیابی ہے۔

ثابت ہوا کہ انسانیت کی معراج، انسان کی کامیابی اور اس کی فوز و فلاح اللہ کی رضا میں پوشیدہ ہے۔ یہ ایک فطری اور جبلی امر ہے کہ ہر چیز اپنے محبوب سے خوش ہوتی ہے انسان اس چیز کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے جس سے اسے محبت ہو، اللہ کی رضا اور خوشنودی ہمیں تب حاصل ہوگی جب ہمیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہو اور اللہ تعالیٰ ہم سے اپنی رضا کا اعلان اسی صورت میں کرے گا جب اسے ہم سے محبت ہو، اس طرح اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے ہمارے ذمہ دو امور واجب ہوگئے:

۱۔ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنا اور اپنے اعمال سے اسے ثابت کرنا۔
۲۔ اللہ کی محبت حاصل کرنا۔

ان دونوں امور کو قرآن نے ایک ہی لڑی میں پرو دیا اور ایک کام مخلوق کے ذمہ لگا دیا۔ اس کام کو سرانجام دے کر مخلوق اپنے خالق سے محبت کا ثبوت بھی پیش کرنے والی ہوگی اور اپنے خالق و مالک کی محبت حاصل کرنے والی بھی اور وہ کام یہ ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ [آل عمران ۳:۳۱]

اے نبی کریم آپ ان سے کہیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کے مدعی ہو تو میری اتباع کرو،
اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور لغزشات کو معاف کر دے گا۔

اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و پیروی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بغیر مخلوق اپنے خالق سے محبت کا ثبوت پیش کر سکتی ہے، نہ اس کی محبت کو حاصل کر سکتی ہے۔ مزید براں فوز و کامیابی کے حصول کا صراحتاً یہ طریقہ بھی ذکر کیا گیا ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا [الاحزاب ۳۳:۷۱]

جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، سو وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ انسانیت کی ابتداء و آغاز بھی اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مضمر ہے اور اس کا حسن انجام، فلاح و کامیابی بھی اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پنہاں ہے۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کی ندامت و شرمندگی کا ذکر کرتا ہے جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کرتے تھے، ارشاد ہوا:

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَا اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا [الاحزاب ۳۳:۶۶]

جس روز دوزخ میں ان کے چہرے الٹ پلٹ کیے جائیں گے، یوں کہتے ہوں گے اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی، اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔

جب یہ کفار و منکرین رسول جہنم کے عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے تو ان پر یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی کہ اگر ہم اپنی دنیاوی زندگی میں اپنی نفسانی خواہشات کے بجائے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے تو اس المناک، تکلیف دہ اور دائمی عذاب میں مبتلا نہ ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور جنت کی نعمتوں کو پانے والے ہوتے۔

ایمان کی بنیاد اتباعِ سنّت

قرآن کریم کی متعدد آیات میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ ان آیت سے یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ ایمان باللہ کی تکمیل ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ [آل عمران ۳:۱۷۹]

ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، اگر تم ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لیے بہت بڑا بدلہ ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ [النساء ۴:۱۳۶]

اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان قائم رکھو۔

قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ [النساء ۴:۱۷۰]

تمہارے پاس آیا اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم حق کے ساتھ تمہارے رب کی جانب سے پس تم اس پر ایمان لاؤ۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ [النساء ۴:۱۷۱]

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور اللہ کو تین نہ قرار دو۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ [الاعراف ۷:۱۵۸]

ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ خود بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

علماء نے ایمان کے معنی ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

هوالتصديق بما علم مجئی الرسول به ضرورة اجمالا فيما علم اجمالا و تفصيلا فيما علم تفصيلاً (۲)

یعنی جن چیزوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لانے کا واضح طور پر علم ہو جائے تو اجمالی چیزوں کی اجمالا اور تفصیلی چیزوں کی تفصیل کے ساتھ تصدیق کرنے کو ایمان کہتے ہیں۔

گویا ایمان کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انسان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول، فعل اور تقریر کی تصدیق کرے۔ ان کا انکار ایمان کے خلاف ہے اور یہ انکار انسان کو ایمان کی حدود سے نکالنے والا ہوگا۔

قرآن کریم انہی لوگوں کو اہل ایمان تصور کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان رکھتے ہوں۔ ارشاد ہوا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ [النور ۲۴:۶۲]

بالشبہ مسلمان وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جس کے لیے انہیں جمع کیا گیا ہے تو (ضرورت پڑنے پر) جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہیں لے لیتے، جاتے نہیں۔

ایمان کا یہ مفہوم اُوپر گزر چکا کہ ایمان محض اس چیز کو مان لینے کا نام نہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں بلکہ ایمان کی بنیاد ان تمام باتوں کی تصدیق ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہم تک پہنچیں خواہ وہ وحی متلو کی شکل میں ہوں یا وحی غیر متلو کی صورت میں، ان تمام چیزوں کی تصدیق اور ان کو حجت ماننا ایمان ہے۔ اس بات کو اگر فلسفیانہ نظر سے دیکھیں تو یہ کہا جائے گا کہ یہ موجبہ کلیہ ہے۔ ایمان تمام چیزوں کے ماننے کا نام ہے اور اس کی نقیض اور ضد سالبہ جزئیہ ہوتی

۲۔ فضل الباری ۱:۲۴

ہے۔ کسی ایک چیز کا انکار بھی کفر ہوگا۔ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی چیزوں میں سے ایک حصہ پر ایمان رکھتا ہے اور دوسرے کی حجیت کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کا ایمان نامکمل ہے۔

قرآن کریم نے انبیاء، سابقین اور مومنین کے ایمان کی حقیقت بیان فرماتے ہوئے کہا ہے:

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ [البقرۃ ۲:۲۸۵]

ایمان رکھتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور مومنین بھی سب کے سب ایمان رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اس کے فرشتوں کے ساتھ اس کی کتابوں کے ساتھ کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

غرضیکہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ ایمان بالرسول کا تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کی جائے۔ محض تصدیق سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس ضمن میں بعض اہلِ علم اس غلطی کا شکار ہوئے کہ ایمان کے لیے محض تصدیق کافی ہے، اطاعت ضروری نہیں۔ مولانا سید بدر عالم اس غلطی کی نشاندہی کرنے کے بعد تصدیق کے ساتھ اطاعت کے امر کو ضروری قرار دینے کی دو وجوہ بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"اولاً تو اطاعت کے بغیر ایمان ہی حاصل نہیں ہوسکتا، دوم قلبی تصدیق حاصل ہو جانے کے بعد یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اطاعت کا عہد دل میں نہ پیدا ہو جائے"۔

جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا عہد نہیں کرتا، یقیناً وہ دل سے اس کی تصدیق بھی نہیں کرتا۔ اسی بناء پر ہرقل بادشاہ کو مسلمان نہیں کہا گیا حالانکہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلی محفل میں تصدیق کر لی تھی، اگرچہ اپنی قوم کی برہمی دیکھ کر بعد میں بات اِدھر اُدھر کر دی تھی، اسی طرح حضرت ابو طالب کی تصدیق بھی ان کے اشعار سے ثابت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود جمہور اُمت نے ان کا ایمان تسلیم نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہزار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی ہو لیکن جب ان کے دل نے معمولی انسانوں کی خاطر رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا قبول نہیں کیا تو ان کو مسلمان کیسے کہہ دیا جائے(۳)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

۳۔ بدر عالم، حجیت حدیث ص ۶۱

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَاغَوٰى وَمَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى [النجم۵۳:۱ تا ۴]

قسم ہے (مطلق) ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے۔ یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے نہ راہ (حق) سے بھٹکے، نہ غلط راستہ ہو لیے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش نفسانی سے بات بناتے ہیں۔ آپ کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

اس آیت مبارکہ کو نقل کرنے کے بعد مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ فرماتے ہیں: یعنی جس طرح ستارہ اپنی ایک معین رفتار پر چلتا ہے۔ ذرہ برابر ادھر یا ادھر نہیں ہو پاتا اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آسمانِ نبوت و رسالت کے ایک ستارے ہیں جو راہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر فرما دی ہے اس سے ذرہ برابر آگے پیچھے نہیں ہو سکتے اور جس طرح ظاہری ستاروں کا نظام محکم ہے، اسی طرح بلکہ زائد باطنی اور روحانی ستاروں کا نظام محکم ہے[۴]۔

مندرجہ بالا آیت کے صحیح مفہوم اور اس کی مراد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ''نطق'' (گفتگو) کے لفظ کے معنی سمجھے جائیں۔ امام راغب اصفہانی ''نطق'' کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نطق:

الاصوات المقطعة التی یظهرها اللسان و تعیها الاذان [۵]

یہ منقطع آوازیں جو زبان سے ظاہر ہوں اور کان انہیں محفوظ کریں۔

امام راغبؒ کے بیان کردہ اس مفہوم سے بات سمجھ میں آتی ہے کہ نطق جن اصوات کو کہا جاتا ہے ان میں انقطاع موجود ہوتا ہے وہ مسلسل نہیں ہوتیں، جبکہ قرآن کریم کی قرأت و تلاوت میں آواز کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔ مزید یہ کہ ان اصوات کے اندر ترتیب کا پایا جانا ضروری نہیں ہوتا جبکہ قرآن کریم کی تلاوت کرنے والی صورت ایک خاص ترتیب کے ساتھ اور ایک نظم کے ساتھ منظم ہوتی ہے۔ اس تسلسل اور نظم و ترتیب کی بناء پر قرآن کریم کے پڑھنے کو نطق سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم کے تلفظ کے لیے حسب ذیل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:

قرأۃ، تلاوت، ترتیل

قرأۃ کے معنی امام راغبؒ نے یہ بیان کیے ہیں:

ضم الحروف والکلمات بعضها الی بعض فی الترتیل [۶]

پڑھتے وقت ایک حرف کو دوسرے حرف اور ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے ملانا

۴۔ کاندھلوی، حجیت حدیث ص ۲۸، ۲۹

۵۔ المفردات فی غریب القرآن ص ۴۹۷، بذیل مادہ نطق

۶۔ ایضاً: ص ۴۰۲

اسی طرح ترتیل کے معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اتساق الشئی وانتظامه علی استقامة (۷)

کسی چیز کا دوسری چیز کے ساتھ استقامت اور نظم و ضبط کے ساتھ ملانا

ان معانی پر غور کرنے سے ان الفاظ کی حسب ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ حروف اور الفاظ کا ملانا

۲۔ ترتیل و ترتیب کا لحاظ

۳۔ حروف و الفاظ کو کسی خاص نظم کے تحت ملانا

۴۔ تلفظ میں استقامت و تسلسل

قرآن کریم کے اس انداز و اسلوب سے یہ بات واضح ہوئی کہ قرأت قرآن کے لیے وہی لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے جو درج بالا خصوصیات کا یا ان میں سے اکثر کا حامل ہو۔ جب لفظ نطق کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یہ خصوصیات نہیں پائی جاتیں، لہٰذا اس کو قرأت قرآن یا تلفظِ قرآن کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف قرآن کریم بلکہ کسی بھی آسمانی صحیفہ یا کتاب کے پڑھنے یا اس کا تلفظ کرنے کے لیے لفظ نطق استعمال نہیں کیا۔ قرآن کریم میں نطق کا لفظ گیارہ مرتبہ استعمال ہوا ہے، ان مقامات کے جائزہ اور سیاق و سباق سے اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ نطق قرآن کریم میں کن کن معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں لفظ نطق تین مرتبہ استعمال کیا گیا ہے اور تینوں مرتبہ اس کی نسبت بتوں کی جانب کی گئی۔ سورہ صٰفّت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بتکدہ میں اس وقت گئے جبکہ تمام مشرکین اپنے کسی میلہ میں گئے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اَلَا تَاْكُلُوْنَ مَالَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ [الصّٰفّٰت ۳۷:۹۱،۹۲]

کیا تم کھاتے نہیں ہو، تم کو کیا ہوا تم تو بولتے بھی نہیں ہو۔

بعد ازاں ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کو توڑ دیا اور قوم کے استفسار پر فرمایا:

فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ [الانبیاء ۲۱:۶۳]

سو ان (ہی) سے پوچھ لو (نا) اگر یہ بولتے ہوں۔

اس پر قوم نے جواب دیا:

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰؤُلَاءِ يَنْطِقُوْنَ [الانبیاء ۲۱:۶۵]

(اے ابراہیم علیہ السلام) آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ یہ بت بولتے نہیں۔

۷۔ المفردات فی غریب القرآن ص ۱۸۷

تین مقامات پر لفظ نطق قیامت کے واقعات کے سیاق و سباق میں واقع ہوا ہے جن میں سے دو مقامات پر روزِ قیامت نطق (گفتگو) کی نفی کی گئی ہے اور ایک مقام پر قیامت کے وقوع کو نطق سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ [الذاریات ۵۱: ۲۳]

تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی وہ (قیامت) برحق ہے جیسا تم باتیں کرتے ہو۔

انسان آپس میں گفتگو کرتا ہے اور اس کلام کے وجود کا اسے یقین ہوتا ہے، اسی طرح قیامت کا یقین دل میں ہونا چاہیے۔

جن دو مقامات پر قیامت میں نطق کی نفی کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہے:

ایک مقام پر قیامت کے مختلف احوال ایک بلیغ پیرائے میں بیان کیے گئے اور ہر مقام پر قیامت کا انکار کرنے والوں کے لیے خرابی و خسارہ بیان کیا گیا اس موقع پر قیامت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ارشاد فرمائی:

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ [المرسلات ۷۷: ۳۵]

یہ وہ دن ہوگا جس میں لوگ نہ بول سکیں گے۔

اسی طرح ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا:

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ [النمل ۲۷: ۸۵]

اور (اب وہ وقت ہے کہ) ان پر وعدہ (عذاب کا) پورا ہوگیا کہ (دنیا میں) انہوں نے (بڑی بڑی) زیادتیاں کی تھیں، سو وہ لوگ بات بھی نہ کر سکیں گے۔

قیامت کے دن کے متعلق دیگر آیات میں کلام اور گفتگو کا ذکر ہے اور ان دو آیات سے گفتگو کی نفی کی گئی ہے اس کی ایک وجہ علامہ آلوسیؒ یوں بیان کرتے ہیں کہ قیامت کا دن ایسا دن ہوگا جس میں کچھ عرصہ و وقت کلام و گفتگو کی جا سکے گی اور کچھ مدت گفتگو کی ممانعت ہوگی یا سکت نہ ہوگی۔ علامہ آلوسیؒ اس کی ایک اور بلیغ اور قرینِ قیاس وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آیت "یوم لا ینطقون" میں نطق نہ ہونے سے مراد ایسا نطق ہے کہ جو انہیں نفع پہنچا سکے اور وہ گفتگو جو ان کو نفع نہ پہنچا سکے ایسی ہے جیسے انہوں نے گفتگو کی ہی نہیں (۸)۔

دو مقامات پر قرآن کریم نے نطق کا لفظ نامۂ اعمال کے لیے استعمال کیا ہے جب تمام لوگوں کی زندگیوں کے اعمال کا اعلان واضح طور پر کر دیا جائے گا۔

ارشاد ہوا:

وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ [المومنون ۲۳: ۶۲]

۸۔ روح المعانی ۲۹/۱۷۷

اور ہمارے پاس ایک دفتر (نامۂ اعمال کا) محفوظ ہے جو ٹھیک ٹھیک سب کا حال بتائے گا اور لوگوں پر (ذرا) ظلم نہ ہوگا۔

هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ [الجاثیہ ۴۵:۲۹]

(اور کہا جاوے گا کہ) یہ (نامۂ اعمال) ہمارا دفتر ہے جو تمہارے مقابلہ میں ٹھیک ٹھیک بول رہا ہے۔

ان دونوں مقامات پر نطق سے مراد ظاہر کر دینا ہے۔

قیامت کے دن انسانی اعضاء خود اس انسان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اس پر انسان ان اعضاء سے سوال کرے گا کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی جس پر وہ اعضاء کہیں گے:

اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ [حم السجدہ ۴۱:۲۱]

ہم کو اس اللہ نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی۔

قرآن کریم کی ان تصریحات، نطق کے ان استعمالات اور نطق کی لغوی تشریح سے چند امور سامنے آتے ہیں جس سے نطق کے مفہوم و استعمالات کے سمجھنے میں آسانی ہوگی:

۱۔ نطق کا لفظ قلیل ترین گفتگو اور محض چند کلمات کی ادائیگی پر بھی صادق آ جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بتوں سے نطق کی نسبت کی گئی کہ وہ چند کلمات کی ادائیگی سے بھی قاصر و عاجز ہیں۔

۲۔ نطق جس گفتگو کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کا مربوط ہونا ضروری نہیں جیسا کہ نطق کی لغوی تشریح سے واضح ہوا۔

۳۔ ان مقامات میں سے کسی ایک مقام پر بھی نطق کا لفظ تلاوتِ کتاب یا کسی لکھی ہوئی چیز کے پڑھنے کے لیے استعمال نہیں ہوا۔

۴۔ ان میں سے ہر مقام پر اللہ تعالیٰ نے نطق کی نسبت مخلوق کی جانب کی ہے۔ کسی بھی مقام پر اپنی گفتگو یا اپنے کلام کو نطق سے تعبیر نہیں کیا۔

۵۔ نطق کا لفظ قرآن کریم یا کسی آسمانی کتاب کی تلاوت و قرأت یا اس کے تلفظ کے لیے کسی جگہ استعمال نہیں کیا گیا۔

ماہرین لغت کی آراء کی روشنی میں نطق کی اس لغوی وضاحت اور قرآن کریم میں مختلف مقامات پر اس کے استعمالات سے یہ بات واضح ہوئی کہ قرآن کریم نے اس لفظ کو کسی بھی موقع پر مربوط اور طویل کلام یا گفتگو کے لیے استعمال نہیں کیا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ''منطق'' سے اللہ کی وحی مراد ہے، نہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو، درست نہیں ہے۔

اطاعتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن کریم میں بیس سے زائد مقامات پر اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، ان آیات کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اطاعت کے لفظی معنی پر گفتگو کی جائے۔ مشہور ماہر لغت علامہ ابن منظورؒ

لکھتے ہیں: "الطوع نقیض الکرہ"[۹] طوع، کرہ (زبردستی) کی ضد ہے۔

گویا اطاعت اس اتباع اور پیروی کو کہا جاتا ہے جو خوشی اور رضامندی کے ساتھ ہو۔ ''مدالقاموس'' میں لفظ طوع کی وضاحت ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے:

طاع، یطاع Each of these verb may be rendered, he was or became obedient or he obayed.[۱۰]

امام راغب ''مفردات'' میں لکھتے ہیں: "الانقیاد و یضاده الکره قال (أتیا طوعاً او کرھا)"[۱۱] (طوع سے مراد سرتسلیم خم کرنا ہے، اور اس کی ضد کرہ (زبردستی) آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو فرمایا: تم آؤ خوشی کے ساتھ یا مجبوری میں)۔ معلوم ہوا کہ طاعت کے لفظ میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ یہ انقیاد وتسلیم کسی بیرونی جبر و اکراہ کے نتیجہ میں نہ ہو بلکہ انسان کے اندر پائے جانے والے اس جذبہ کی وجہ سے ہو جو اسے کسی حکم کی پیروی پر آمادہ کرتا ہے۔ قرآن کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو مستقل اطاعت قرار دیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کی اتباع اور پیروی کو ایمان کے لیے ضروری اور لازمی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِيْنًا [الاحزاب ۳۳:۳۶]

کسی مسلمان مرد یا عورت کو یہ اختیار نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ کیا ہو تو وہ اس میں کوئی تذبذب کا مظاہرہ کرے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی وہ بلاشبہ مکمل گمراہ ہوا۔

اس آیت میں یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ فرما دیں، اس فیصلہ سے کسی مسلمان مرد وعورت کو انحراف کا اختیار ہے نہ اس کو قبول کرنے میں کسی تذبذب کے اظہار کا۔ اس کی وجہ یہ ارشادِ ربانی ہے: "وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ" [النساء۴:۶۴] کسی رسول کی بعثت و رسالت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے، اگر اس کی اطاعت نہ کی جائے تو اس کی رسالت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بارہ میں ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ [النساء۴:۸۰]

۹۔ لسان العرب ۲/۲۴۷

۱۰۔ مدالقاموس ص ۱۸۹۱

۱۱۔ المفردات فی غریب القرآن ص ۳۱۰

جس نے اللہ کے رسول کی اطاعت کرلی، اس نے اللہ کی اطاعت کرلی۔

جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو شعار بنائے اس کے بغیر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حق ادا کر سکتا ہے نہ اللہ تعالیٰ کے مطیع ہونے کا ثبوت پیش کرسکتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا ثبوت بھی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی کے ذریعہ ہی پیش کرسکتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ [آل عمران ۳:۳۱]

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے، تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

ائمہ مفسرین نے اس آیت کی جو تشریح و وضاحت کی ہے، اس سے اس نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی مشوروں یا ذاتی رائے سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی نافرمانی بھی کی جا سکتی ہے۔ اطاعت صرف نبوی فیصلوں کی ضروری ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں: پس یہ آیت تمام امور پر حاوی ہے اس طرح جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ کریں تو کسی کو بھی اس کی مخالفت کی گنجائش نہیں اور نہ کسی رائے اور قول کے اختیار کرنے کی (۱۲)۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس آیت مبارکہ کی توضیح یوں کرتے ہیں: یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہ آیت کریمہ دو قسم کے فیصلوں پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے الگ ایک مستقل حجت ہے۔ اگر صرف اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور حکم کافی ہوتا تو اس کے ذکر کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے ذکر کی علیحدہ ضرورت نہ تھی (۱۳)۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی کا حکم دیا گیا ہے، اس اتباع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دو علیحدہ علیحدہ حیثیتیں نہیں بنائی گئیں کہ ایک آپ کی ذاتی حیثیت ہے اور ایک آپ کی نبوی حیثیت۔

قرآن کریم کی تعلیمات ہوں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، ضروری یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے قبول کیے جائیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ فیصلہ نبوی کو طوعاً و کرھاً قبول نہ کریں بلکہ مکمل خوشی، یکسوئی اور بشاشتِ قلبی سے قبول کریں اور ایسے لوگ ارشاد ربانی کے مطابق: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ [النساء ۴:۶۵] دائرہ ایمان سے باہر ہیں۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا:

۱۲۔ تفسیر القرآن العظیم ۳/۴۹

۱۳۔ کاندھلوی، مقدمۃ الحدیث (مخطوط) بحث حجیتِ حدیث

والذی نفسی بیدہ لایؤمن احدکم حتّٰی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ[۱۴]

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس چیز کے تابع نہ ہو جائیں جسے میں لے کر آیا ہوں۔

مندرجہ بالا آیت اور حدیث دونوں سے کسی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں نظام نبوت یا ذاتی رائے کی تقسیم کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ جب قرآن نے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تقسیم بیان کی، نہ صحابہؓ نے اس کا لحاظ رکھا تو آج اس طرح کی تقسیم کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک اسوۂ کاملہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [الاحزاب ۳۳:۲۱]

تحقیق تمہارے لیے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں عمدہ نمونہ ہے۔

امام راغبؒ "اسوۃ" کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "وھی الحالۃ التی یکون الانسان علیھا فی اتباع غیرہ ان حسنا وان قبیحا"[۱۵] اسوہ انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے کی اتباع اور پیروی میں وہ اپنے لیے اختیار کرے خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری۔ یعنی لفظ "اسوۃ" میں خود اتباع کا مفہوم پایا جاتا ہے پھر "حسنۃ" کی صفت کے بعد اس میں مزید تاکید پیدا کر دی گئی کہ اسوۃ بذاتِ خود قابل اتباع اور پیروی کے لائق چیز ہے وہ اگر اللہ تعالیٰ کی نظر میں بھی اچھا ہو تو اس کا اتباع عقلاً مزید واجب ہو جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اسی معنی میں امت کے لیے اسوہ قرار دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اتباع اور پیروی میں انسان کی جو حالت و کیفیت ہوتی ہے اگر اس کا مشاہدہ کرنا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کرو اور پھر اس کی اتباع اور پیروی کرو تو گویا تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور پیروی کرنے والے ہو جاؤ گے، اردو میں اسوۃ کا ترجمہ نمونہ سے کیا جاتا ہے یعنی اگر تم کو خدا کی اطاعت و پیروی کا عملی، زندہ اور مکمل نمونہ دیکھنا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دیکھ لو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و پیروی کی ایک واضح اور مکمل تصویر ہے۔ مولانا کاندہلویؒ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کو فقط اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ فقط بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچا کر اپنی منصبی خدمات سے فارغ ہو جائیں بلکہ وہ من جانب اللہ اُمت کے لیے معلم، ہادی، مصلح اور مربی بلکہ اسوہ حسنہ بنا کر بھیجے گئے ہیں تاکہ ان کا ہر قول، ہر فعل، ہر بیان و سکوت امت کے لیے حجت اور مشعل ہدایت ہو اور اللہ کے بندوں کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کی اطاعت اس طرح کرو جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھتے ہو۔"[۱۶]

۱۴۔ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ۱/۳۳۲

۱۵۔ المفردات فی غریب القرآن، ص ۱۴ بذیل مادہ

۱۶۔ کاندھلوی، حجیت حدیث ص ۳۳۔ ۳۴

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: یہ آیت کریمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کی اتباع میں ایک بڑی اصل اور دلیل ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے احزاب کے دن مسلمانوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صبر، استقامت کا حکم دیا(۱۷)۔ یعنی اگرچہ آیت کا شانِ نزول ایک خاص محل اور واقعہ ہے لیکن یہ حکم محض اس واقعہ کے ساتھ خاص نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس واقعہ میں قابلِ پیروی ہے، باقی احوال میں نہیں بلکہ یہ حکم عام ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ و مرحلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی اتباع ازروئے آیت ہمارے لیے از بس ضروری ہے۔

دوسرا قابلِ غور امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو ہمارے لیے نمونہ بنایا۔ بالفاظ دیگر قرآن ایک تحریری دستاویز (Document) ہے اور اس کی عملی شکل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے جسے عرف عام میں اسوۂ حسنہ کہا جاتا ہے۔

قرآن انسانی زندگی کے لیے ایک مکمل اور جامع دستاویز ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا قرآن کی طرح اس کا عملی نمونہ بھی جامع ہے یا نہیں؟ ابتداً اس سوال کے جواب میں دو صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں: اثبات یا نفی۔ اگر ہمارا جواب نفی میں ہو اور ہم یہ دعویٰ کریں کہ نمونہ کامل نہیں تو اس میں دو احتمالات پیدا ہوتے ہیں: اولاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے مطابق یہ نمونہ ایک کامل و مکمل اور جامع نمونہ بنایا تھا مگر دنیا میں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ مکمل نہیں ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے علام الغیوب اور علم کی تمام وسعتوں پر حاوی ہونے سے انکار پر مبنی ہے۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ [البقرۃ ۲:۲۵۵]

وہ جانتا ہے وہ تمام چیزیں جو ان کے سامنے ہیں، اور وہ تمام چیزیں جو ان کے پیچھے ہیں اور اس کے احاطۂ علمی سے کوئی چیز باہر نہیں سوائے اس کے جس کو وہ چاہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ یہ نمونہ مکمل و جامع نمونہ نہیں مگر اس سے زیادہ جامع نمونہ بنانے پر وہ نعوذ باللہ قادر نہ تھے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت قدرت میں نقصان لازم آتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ [البقرۃ ۲:۲۰]

بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو نامکمل مان کر اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی صفت علام الغیوب اور صفت قدرت میں شک، تردد یا انکار کی صورت پیدا ہوتی ہے اور جو شخص اللہ کی کسی ایک صفت میں شک و تردد رکھتا ہے، دائرۂ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات پر بلا کسی شک و تردد کے ایمان کامل ہو اور یقین صادق ہو۔ ایمان کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اس قدر پختہ یقین ہو کہ گویا وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

۱۷۔ تفسیر القرآن العظیم ۳/۴۷۵

ان تعبداللہ کانک تراہ[۱۸] یعنی عبادت کی معراج یہ ہے کہ تو اس طرح عبادت کرے کہ تو خدا کو دیکھ رہا ہے اور یہ بات یقین کامل کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

اگر ہمارا جواب اثبات میں ہو اور ہم اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل مان لیں تو ہمیں اس کی حجیت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر قرآن پر عمل تو درکنار اس کا سمجھنا بھی مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ صحیح بخاری میں کتاب الصلوٰۃ کی ابتداء میں ایک طویل حدیث نقل کی گئی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ واقعہ معراج میں پنجگانہ نماز کی فرضیت کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام امام بنے اور دو دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازیں پڑھوائیں، پہلے دن تمام نمازیں شروع وقت میں اور دوسرے دن تمام نمازیں آخیر وقت میں پڑھوائیں اور اس کے بعد فرمایا۔ "بھذا امرت"

اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے اس لفظ کے معنی ت کے زبر کی صورت میں یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی انہی اوقات میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ت پر پیش کی صورت میں جو ایک روایت میں ہے،معنی یہ ہوں گے کہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان اوقات صلوٰۃ کو پہنچانے کا حکم اسی طرح کیا گیا تھا[۱۹]۔

بہرحال صیغہ مخاطب کا ہو یا متکلم کا، اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنت اللہ یہی ہے کہ اپنے احکام و اوامر، عبادات و طاعات کے طریقے، اوقات اور آداب اس طرح سکھائے جاتے ہیں کہ ایک فرشتہ ان اعمال کو بجا لا کر دکھاتا ہے اور اس کے وہ تمام اعمال حکم خداوندی کے تابع ہوتے ہیں اور نبی پر ان کا اتباع ایسے ہی واجب ہوتا ہے جیسے کسی قولی وحی کا۔

یہ طریقہ نبی کے لیے اپنے احکام کی وضاحت وتفصیل کا تھا۔ امت کے لیے یہ طریقہ متعین کیا گیا کہ انبیاء علیہم السلام کے تمام اعمال و افعال کو اُمت کے لیے ہر حالت میں قابلِ تقلید بنا دیا اور واضح کر دیا کہ نبی کا کوئی قول اور فعل اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہٹ کر یا اس کا مخالف نہیں ہوتا اور نبی کی تمام حرکات و سکنات، بیداری کی اور حالتِ نوم کی صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں اور جس طرح نبی پر اس فرشتۂ معلّم کی اتباع ضروری ہے کہ وہ حکم خداوندی پر نازل ہوا ہے، اُمت پر اس نبی کی اتباع واجب وضروری ہے کہ وہ بھی مامور من اللہ اور معصوم من اللہ ہے۔ آیاتِ قرآنیہ کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقام فرشتوں سے بڑھ کر اور عالی تر ہے۔ لہٰذا جب فرشتے کی اطاعت انبیاء علیہم السلام کے لیے بحکم الٰہی خاص حالات میں ضروری ٹھہری تو انبیاء علیہم السلام کی اطاعت اُمت کے لیے لازماً واجب ہوگی۔

قرآن کریم کی ان واضح وصریح آیات اور ان کی تشریح وتوضیح سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اُمت کے لیے مطلقاً واجب الاتباع و اطاعت ہے یہ قرآن کریم کے

۱۸۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل علیہ السلام

۱۹۔ فتح الباری ۵/۲

فہم، اس پر عمل اور عملی شکل میں متشکل دیکھنے کے لیے اولین بنیاد و اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز کو بلند کرنے پر اعمال کے ضائع ہونے کی سزا کا بیان، ہر اس چیز کو لینے کا حکم جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا، جس سے منع فرما دیا اس سے رک جانے کا حکم اور نزولِ قرآن کا مقصد "تبیین للناس" [النحل ۱۶:۴۴] یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا، ان تمام حقائق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم اُمت کے دل و دماغ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق زندگی کی عظمت کو اُجاگر کرنا چاہتا ہے اور یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ اُمتِ محمدیہ کے افراد قرآنِ کریم کی عظمت، اللہ تعالیٰ کے احکام کی حرمت اور ان پر اطاعت و مداومت سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کیے بغیر حاصل نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالیٰ کی توحید و الوہیت کے اقرار کے بغیر یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر انسان کسی بھی صورت میں اپنے آپ کو مؤمنین کی صف میں شامل نہیں کر سکتا۔ نبوت و رسالت کے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے ہر نبی اور پیغمبر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و رسالت کی خبر دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی کا نہ صرف حکم دیا بلکہ تاکید و تلقین فرمائی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم میں ہے ارشاد ہوا:

يَا بَنِی اِسْرَائِيْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّراً بِرَسُوْلٍ يَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِیْ اِسْمُهٗ اَحْمَدُ [الصف ۶۱:۶]

اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو تورات آ چکی ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آنے والے ہیں جن کا نام (مبارک) احمد ہوگا میں ان کی بشارت دینے والا ہوں۔

درحقیقت بنی اسرائیل کی فوز و فلاح اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا استحقاق اسی میں مضمر ہے۔ ارشاد ہوا:

وَرَحْمَتِی وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيَاتِنَا يُؤْمِنُوْنَ۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْباً عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ [الاعراف ۷:۱۵۶-۱۵۷]

اور میری رحمت تمام اشیاء کو محیط ہو رہی ہے، تو وہ رحمت ان لوگوں کے نام تو لکھوں گا جو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، جو لوگ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان قرآن کریم کی تمام تر فصاحتوں، اعجاز، بلاغت و جامعیت کے باوجود اس کو سمجھنے،

اس میں تدبر اور اس پر عمل کے لیے سنتِ نبوی کا کیوں محتاج ہے؟ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید کی جامعیت کا صحیح مفہوم، اس کے قطعی تصور اور اس کی صائب مراد تک رسائی حاصل کی جائے۔

قرآن کی جامعیت

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریباً ۲۳ برس کی مدت میں دو مرحلوں میں یعنی ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ قرآن کریم کا اعجاز، اس کے الفاظ وکلمات، اس کی آیات وتعبیرات، اس کی تشبیہات و استعارات، اس کے ضرب الامثال و محاورات، اس کے اشارات اور اس کی تلمیحات اس بات کی گواہ ہیں کہ یہ مخلوق کا کلام نہیں بلکہ اس حاس کائنات کا کلام ہے جس کے علم کی کوئی حد ہے اور نہ قدرت کی کوئی انتہاء۔ قرآن کریم نے اُن عربوں کو جو اپنی قادر الکلامی پر فخر کرتے اور اپنے علاوہ ہر قوم کو عجم (گونگا) کہتے تھے، کھلا چیلنج دیا کہ اگر تمہیں اس کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لاؤ۔ عرب کے ان ادیبوں اور شاعروں نے سرتوڑ کوشش کی لیکن وہ اس کے مقابلہ کا کلام نہ بنا سکے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہر ہر چیز بیان کر دی تو اب سنت کی کیا ضرورت ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے قرآن مجید کی جامعیت کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔

یہ بات اپنی جگہ بجا اور درست ہے کہ قرآن کریم کی جامعیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور جب قرآن کریم کو جامع تصور کر لیا گیا تو پھر بظاہر سنت کی ضرورت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی طرف اشارتاً گفتگو گذشتہ اوراق میں ہو چکی ہے کہ جامعیت کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم جس مقصد کے لیے نازل ہوا ہے اس نے اپنے اس مقصد کی پوری طرح تکمیل کی ہے اور اس کا اسلوب بیان اور الفاظ وکلمات کی ترتیب بہترین ترتیب ہے، اس سے بہتر ترتیب ممکن نہیں لیکن اس کے جامع ہونے کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ ہمیں اس کے سمجھنے کے لیے کسی شرح یا کسی عملی شکل کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم کی جامعیت اس وقت متاثر ہوتی جبکہ یہ دعویٰ کیا جاتا کہ سنت نے قرآن کریم میں فلاں فلاں چیزوں کا اضافہ کیا اور اس اضافہ ہی سے دین مکمل ہوا بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ سنت قرآن کریم کا بیان ہے (اس پر آپ گذشتہ درس اکائی میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں)۔

مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

''قرآن کریم بلاشبہ جامع اور کامل کتاب ہے، مگر جامع اور کامل کتاب کو سمجھنے کے لیے عقل بھی تو جامع اور کامل چاہیے، ناقص اور بیمار عقل تو اس کے لیے کافی نہیں۔ ناقص کا اپنے کو کامل سمجھ بیٹھنا بھی اس کے ناقص ہونے کی دلیل ہے۔ کتاب جس درجہ کامل ہوگی اسی درجہ محتاج شرح ہوگی تاکہ شرح سے اس کے مخفی حقائق اور رموز ظاہر ہوں اور اس طرح سے اس کتاب کا کمال نمایاں ہو۔ جب تک کسی کتاب کے حقائق و معاون کی تفصیل نہ کی جائے، اس وقت تک اس کتاب کا کمال نمایاں نہیں ہوتا''[20]۔

۲۰۔ کاندھلوی، حجیت حدیث

جب آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کریم کتاب جامع ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم کی جامعیت اپنے حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس انتہائی جامع کتاب کو سمجھنے کے لیے عقل بھی انتہائی جامع ہونی چاہیے۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مقابلہ میں اپنی عقل کو زیادہ جامع سمجھتا ہے تو یہی اس کی عقل کے ناقص ہونے کی دلیل ہے۔ اس جامع ترین کتاب کو سمجھنے کے لیے جامع ترین عقل صرف اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے۔ لہٰذا اس کتاب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے پہلا، بنیادی اور جامع مأخذ اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

قرآن کریم کو جامع کتاب کہنے اور ماننے سے سنت کی ضرورت اور حاجت ختم نہیں ہوجاتی۔ یہ احتیاج قرآن کی نہیں قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے کے لیے ہے۔ سنت کے بغیر الفاظِ قرآن کا صحیح تلفظ بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح قرآن مجید کے کسی ایک حکم پر عمل سنت کی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتا، مثلاً قرآن کریم نے سب سے زیادہ حکم اقامتِ صلوٰۃ کا دیا ہے۔ اگر کوئی لغت کی مدد سے اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم کی جامعیت کے اس صحیح تصور کو سمجھنے اور اس جامعیت کے باوجود سنت کی ضرورت و حاجت کو صحیح تسلیم کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کا بھی جائزہ لیا جائے کہ قرآن کریم نے بحیثیت نبی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقام و منصب متعین کیا ہے۔

منصبِ نبوت و رسالت

سنت کی حجیت پر دوسرا شبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت بشری اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوی حیثیت کے حوالہ سے کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ [الکھف ۱۸:۱۱۰]

آپ کہہ دیجئے کہ میں بھی تمہارے جیسا انسان ہوں

ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا:

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ [الشوریٰ ۴۲:۴۸]

آپ کے ذمہ صرف پیغامِ ربانی کو پہنچا دینا ہے۔

یعنی جو کلام آپ پر نازل ہوا ہے بس آپ اسے لوگوں کے سامنے پڑھ دیں آپ کا فرض پورا ہوگیا۔ قرآن کریم میں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا ذکر ہوا ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر ہو رہا ہے۔ قرآن کریم میں دو مقامات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو "بشرٌ مثلُکم" قرار دیا گیا ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی عظمت، قدرت، اور اس کی خلاقیت کو بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور قدر و منزلت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس آیت کا سیاق و سباق اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ عام انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو بیان کر سکتا ہے اور نہ اس کے کلمات کا احاطہ کر سکتا ہے حتیٰ کہ اگر سمندر سیاہی بن جائیں اور ایک مزید سمندر اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے، کلماتِ الٰہی کا احاطہ ممکن نہیں۔ اسی

طرح اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس سے شرف باریابی بھی انسان کی قدرت سے بالاتر ہے۔ ان دونوں مسائل کا حل اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں اُمت کو دیا کہ وہ اپنے کلمات حمد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر القاء کرتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان اور عملِ صالح کی وہ راہ دکھاتا ہے جس پر چل کر اُمت اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شرف حاصل کر سکتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَاداً لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْجِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَداً۔ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَّلَايُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَداً۔
[الکھف ۱۸:۱۱۰]

آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر کا پانی روشنائی کی جگہ ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے اور باتیں احاطہ میں نہ آئیں اگرچہ اس سمندر کی مثل دوسرا سمندر اس کی مدد کے لیے ہم لے آئیں اور آپ یوں بھی کہہ دیجئے کہ میں تو تمہاری طرح انسان ہوں، میرے پاس بس وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود برحق ایک ہی معبود ہے۔ سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

معلوم ہوا کہ کلمات، احکام اور صفاتِ الٰہیہ کا علم حاصل کرنے کا مسئلہ ہو، اللہ تعالیٰ کی توحید اختیار کرنے کا معاملہ درپیش ہو، اس کی عبادت کرنا مقصد ہو، عملِ صالح کے ساتھ زندگی گذارنی ہو، ہر حالت و کیفیت میں انسان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر ان مقاصد کو حاصل کرنے سے قاصر و عاجز ہے۔

دوسرے مقام پر سورت حٰم السجدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو "بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ [حٰم السجدۃ ۴۱:۶]

(اے نبی) کہہ دیں کہ میں بھی تم جیسا آدمی ہوں (ہاں) مجھ پر یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک (اللہ) ہے۔ پس سیدھے اسی کی طرف (متوجہ) رہو اور اسی سے مغفرت مانگو اور مشرکوں پر افسوس ہے۔

اس موقع پر کفار کی معاندانہ سرگرمیوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی ضد بازی کا ذکر کرتے ہوئے ان کو توحید کی دعوت دی اور یہ واضح کیا گیا کہ میں رب کی ربوبیت میں، اور خالق کی خلقیت میں اپنی ذات کو شریک نہیں گردانتا

بلکہ اللہ تعالیٰ کے ایک پیغامبر کی حیثیت سے توحید و الوہیت کی دعوت دیتا ہوں اور اس مہلک عذاب سے ڈراتا ہوں جس نے عاد و ثمود جیسی مضبوط اقوام کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ سورۃ الکھف اور سورۃ حم السجدۃ، دونوں کی سورتیں ہیں اور دونوں میں اس مقام پر خطاب مشرکین سے ہو رہا ہے، انہیں شرک سے بچنے کی نصیحت کی جا رہی ہے، توحید کو اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی اور ذات بھی اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں شریک نہیں ہو سکتی تو کسی اور ہستی کی کیا مجال ہے کہ اللہ کی الوہیت و خالقیت میں شریک ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ مزید یہ کہ کسی نبی کا انسان کی جنس سے ہونا اس کی نبوت کے منافی نہیں اور قرآن کریم نے ان اقوام کی تردید کی جنہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کا اسی بناء پر انکار کیا کہ وہ جنس بشر یعنی انسان تھے۔ قوم عاد و ثمود اور قوم نوح کو ہلاک کیا گیا کیونکہ انہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو صرف اسی بناء پر ماننے سے انکار کر دیا کہ یہ ہمارے ہی جیسے انسان ہیں (۲۱)۔

نوع انسان سے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی حکمت اور وجہ بیان کرتے ہوئے رب ذوالجلال ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا [الاسراء ۱۷:۹۵]

آپ فرما دیجئے کہ اگر زمین پر فرشتے رہتے ہوتے کہ اس میں چلتے بستے تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے۔

جس مخلوق کی ہدایت و اقتداء کے لیے رسول مبعوث ہوتے ہیں، وہ مخلوق بشر ہے نہ کہ ملائکہ۔ اگر ملائکہ کی ہدایت مطلوب ہوتی تو ملائکہ میں سے رسول مبعوث کیے جاتے لیکن انسان کی ہدایت کے لیے ایک ایسے انسان کو رسول بنا کر بھیجا جاتا ہے کہ جس کے اندر شانِ ملکیت بھی ہوتی ہے۔ وہ فرشتہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی وحی حاصل کر کے تمام انسانیت کے لیے ہدایت کا سامان ہوتا ہے۔

جہاں تک دوسری آیت یعنی "اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ" کا تعلق ہے، اس کی وضاحت قرآن کریم میں ایک اور مقام سے ہوتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت کی وضاحت فرمائی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ [آل عمران ۳:۱۶۴] (۲۲)

بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں۔

۲۱۔ دیکھیے: ابراہیم ۱۴:۱۰-۱۱۔ الانبیاء ۲۱:۳۔ المومنون ۲۳:۲۴

۲۲۔ مزید دیکھیے: البقرۃ ۲:۱۲۹، ۱۵۱۔ الجمعہ ۶۲:۲

معلوم ہوا کہ تلاوتِ آیت اللہ کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے تین مقاصد اور ہیں:

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیں گے۔

۲۔ منشاء کتاب پر عمل کرنا سکھائیں گے اور

۳۔ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ان کا تزکیہ کریں گے۔

ان مقامات میں سے کسی بھی مقام پر یہ بات مستفاد ومفہوم نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ مقاصد صرف اس وقت کے لوگوں کے لیے تھے اور بعد کے لوگ براہ راست قرآن کریم سے ''نظامِ ربوبیت'' کو اپنی سمجھ،فہم اور عقل و دانش سے سمجھ کر جو بھی عملی شکل اختیار کریں وہ قرآن پر عمل متصور ہوگا۔

اسی طرح قرآن مجید نے مختلف مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت نمونہ و پیشوا، شارع، شارح کتاب اللہ اور قاضی بیان کیا ہے[۲۳]۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمام حیثیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت دائمی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حیثیت بھی اپنے اندر دوام واستمرار رکھتی ہیں۔

قرآن کریم کی آیات وتعلیمات کی روشنی میں سنت کی حیثیت و حجیت واضح ہوگئی۔ اب سنت کی حیثیت و حجیت کا جائزہ خود سنت اور حدیث کی روشنی میں لیا جائے گا۔

سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم احادیث کی روشنی میں

گذشتہ بحث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ نبوت کے علاوہ یہ بھی واضح ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ قرآن کریم کی عملی شکل، اس کے احکام کی عملی تصویر اور اس کے علوم کا عملی پیکر ہے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جسے اس نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ اُمت کی ہدایت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اُمت کے لیے ایک نمونۂ عمل قرار دیا جس کا لازمی تقاضا ہے کہ جس طرح نظریاتی اور علمی اعتبار سے قرآن کریم ایک جامع کتاب ہے۔ عملی لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی اسی قدر جامع ہو کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے جامع نہ ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینا ایک بے معنی سی بات ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا معیار ہو یا اس کی اطاعت کا، اس کی خشیت مطلوب ہو یا اس کا تقویٰ مقصود ہو، ہر مرحلہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات اور طریق زندگی ہی معیار وحید قرار پاتا ہے حتیٰ کہ عبادات کی مقدار بھی وہی معتبر ہے کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ سے ملتی ہو، اس پر اضافہ وکمی کی اجازت نہیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے جسے صحیحین میں نقل کیا گیا ہے کہ: تین جماعتیں ازواج مطہرات کے پاس آئیں اور ان

۲۳۔ دیکھیے. آل عمران ۳:۳۲۔ النساء ۴:۶۴، ۶۵۔ النور ۲۴:۵۱۔ الشوریٰ ۴۲:۱۵۔ الحشر ۵۹:۷

سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات و عبادات کے متعلق دریافت کیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات انہیں بتا دیئے گئے تو ان کو انہوں نے اپنے لیے ناکافی خیال کیا اور کہا کہ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات ہیں ہماری اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا نسبت۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو معصوم قرار دیا جا چکا اور مغفرت کی جا چکی ہے۔ ان میں سے ایک شخص کہنے لگا میں ہمیشہ ساری رات عبادت کروں گا، دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھوں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا، تیسرے نے دعویٰ کیا کہ میں ہمیشہ عورتوں سے بچوں گا اور کبھی شادی نہ کروں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا:

انتم الذین قلتم کذا و کذا اما واللّٰہ انی لاخشاکم اللّٰہ واتقاکم لہ لکنی اصوم و افطر و اصلی و ارقد و اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی (۲۴)

تم لوگوں نے اس طرح کہا تھا سنو! میں تم سب سے زیادہ اللہ کی خشیت اور اس کا تقویٰ رکھنے والا ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں پس جو میری سنت سے احتراز کرے گا، وہ میری جماعت میں سے نہیں۔

معلوم ہوا کہ عبادت کا طریقہ ہو یا خشیت الٰہی کی منزل، ہر سو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق زندگی ہی معتبر ہے، اس سے انحراف، احتراز اور تجاوز اس فرد کو امت سے نکالنے والا ہوگا پھر اس کی عبادت عبادت رہے گی اور نہ وہ خشیت الٰہی کی منزل پا سکے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو نہ صرف سنت کی پیروی کا حکم دیا بلکہ اس سے احتراز و انحراف کرنے والوں کے خلاف جہاد کا حکم دیا۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مامن نبی بعثہ اللّٰہ فی امتہ قبلی الاکان لہ فی امتہ حواریون اصحاب یاخذون بسنۃ واقتدوہ بامرہ ثم انہا تخلف من بعدھم خلوف یقولون مالایفعلون و یفعلون مالا یؤمرون فمن جاھدھم بیدہ فھو مؤمن، ومن جاھدھم بلسانہ فھو مؤمن ومن جاھدھم بقلبہ فھو مؤمن و لیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل (۲۵)

اللہ نے مجھ سے قبل جو بھی نبی بھیجا، اس کے کچھ ساتھی بھی پیدا فرمائے جو اس نبی کی

۲۴۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۲۷

۲۵۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۳۰

سنت پر عمل کرتے اور اس کی ہدایات کی اقتداء کرتے پھر ایک جماعت ان احکام کی مخالف پیدا ہو جاتی جس کے قول وفعل اور عمل و ہدایت میں تضاد ہوتا، پس جو جماعت ان سے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن، جو زبان سے جہاد کرے وہ مومن اور دل سے جہاد کرے وہ بھی مومن لیکن اس سے آگے ایمان رائی کے برابر بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہر نبی کی امت میں جہاں ایسے اصحاب پیدا ہوئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی حفاظت کی اور ان کی ہدایات پر عمل کیا، وہاں ایسے ملحدین بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نبی کی سنت سے انحراف کیا، ان لوگوں سے جہاد کرنا عین ایمان ہے جس کا ادنی درجہ یہ ہے کہ ان کو دل سے برا سمجھا جائے۔ معلوم ہوا کہ سنت سے انحراف کرنے والے کو برا نہ سمجھنا دل میں رائی کے برابر بھی ایمان نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے تو بذاتِ خود سنت سے انحراف و احتراز کس قدر مذموم فعل ہوگا۔ ایمان کی اس ابتدائی منزل، خشیت الٰہی کے حصول کے بعد اس دنیوی زندگی کے بعد اخروی زندگی کا مرحلہ درپیش ہے، اس مرحلہ پر فوز و فلاح اور کامیابی حاصل کرنے والے کون لوگ ہیں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنۃ [۲۶]

جس نے میری سنت سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی، وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

اگر کوئی شخص جنت میں داخلہ چاہتا ہے اور وہ وہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت چاہتا ہے تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا مفہوم یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے محبت رکھے۔ وہ کیا خوب مقام ہے جو اللہ تعالیٰ جنت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کی روشنی میں زندگی میں جو اصلاح پیدا کرتی ہے، اس کو چند بنیادوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ عقائد و ایمانیات
۲۔ اعمال و عبادات
۳۔ معاشرت و معاملات
۴۔ حکومت و سیاسیات

۲۶۔ مشکوۃ المصابیح، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۳۰

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کو دو واضح حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے، قبل از ہجرت کی زندگی اور بعد از ہجرت، اور یہ پورا دور ۲۳ سالوں پر محیط ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ۲۳ سالہ نبوی زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوگا اول الذکر دو امور اس پورے دور میں ہمیشہ اہمیت کے حامل رہے۔ نبوی زندگی کے اول دن سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر "اقرا" کی وحی نازل ہوئی تھی، اپنی حیات مبارکہ کے انتہائی آخری مراحل تک جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مرض الوفات میں تھے یہ حکم فرما رہے تھے:

مروا ابابکر ان یصلی بالناس (۳۰)

ابوبکرؓ کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

ایمان، اعتقاد، اعمال و عبادات کی اصلاح کی فکر دامن گیر رہی، اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ سیرت طیبہ کا اساسی اور غالب پہلو بھی ایمانیات و اعمال ہیں کہ امت کا ہر فرد اپنے ہر کام کو اپنے لیے عادت کی بجائے عبادت سمجھ کر سرانجام دے، اس کے ہر کام کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہو، تکمیل خواہش نفس نہ ہو؛ کیونکہ یہی دراصل وہ بنیاد و اساس ہے کہ جس کی اصلاح کے بعد انسان کی معیشت و معاشرت اور اس کی سیاست و قیادت کی اصلاح ممکن ہے۔ دل میں اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان، اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل یقین، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اتباع اور پیروی کے عہد کے بغیر فرد اپنی معیشت درست کر سکتا ہے نہ معاشرہ اپنی سیاست کی اصلاح کر سکتا ہے۔ ایمان و اعمال کی اصلاح کے بغیر اصلاح معاشرہ و سیاست یا ایک انقلاب صالح کی بات ایک غیر فطری ترتیب ہے جسے گھوڑی گھوڑے کے آگے باندھنے کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔

مسلمانان عالم اس دور میں ایک صالح انقلاب برپا کرنے میں ہنوز اس لیے ناکام نظر آتے ہیں کہ انہوں نے جس ترتیب کو اختیار کیا وہ نبوی ترتیب سے تعلق رکھتی ہے نہ ترتیب الٰہی سے اور نہ ہی فطرت انسانی کا میلان اس کی جانب ہے۔ ترتیب الٰہی میں بھی یہی چیز کارفرما نظر آتی ہے کہ مکی آیات اور سورتوں میں ایمان و اعمال کی اصلاح کی دعوت دی گئی اور مدنی آیات میں عبادات و معاملات کے احکام، حلال و حرام، فرائض و واجبات، غزوات و جہاد اور حکومت و سیادت کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ ایمان و اعمال کی اس اصلاح کے بعد اصول قیادت و سیادت بیان کیے گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کا کوئی پہلو عبادت سے خالی نہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست، قیادت اور سیادت ایک ڈھانچہ کی حیثیت رکھتی تھی اور روح عبادت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اور یہ ڈھانچہ اور روح کامل مناسبت کے ساتھ اپنی اپنی ذمہ داریوں میں مصروف تھی، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست ایک زندہ سیاست تھی جو دوسروں کی زندگی کی بھی محافظ تھی۔ جبکہ آج کی سیاست محض ایک ڈھانچہ کا نام ہے جو روح عبادت سے خالی ہونے کی وجہ سے معاشرہ کو مثبت نتائج نہیں دے رہی۔

۳۰۔ مسند احمد بن حنبل ۴/۳۲۱

یہی وہ منہاج تھا جس پر صحابہ کرام کی تربیت ہوئی، خلفائے راشدین ہوں یا دیگر صحابہ کرامؓ سب کے نزدیک بالاتفاق ہر معاملہ میں قرآن حکیم کے احکام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات، آپ کی سنن اور اعمال بنیادی و اساسی مصدر کی حیثیت رکھتے تھے۔

سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے نزدیک

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیقؓ خلافت پر متمکن ہوئے تو منکرین زکوٰۃ کا فتنہ اٹھا۔ مدینہ میں بعض لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور استدلال یہ پیش کیا کہ قرآن نے خاص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زکوٰۃ لینے کا حکم دیا ہے اور اس کے نتیجہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لیے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

> خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ [التوبۃ ۹:۱۰۳]
>
> آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ان کے مالوں میں سے صدقہ لیں جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پاک صاف کر دیں گے اور ان کے لیے دعا کیجئے بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ان کے لیے موجب اطمینان ہوگی۔

اس آیت سے وہ استدلال کرتے تھے کہ اب جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے ہیں اب کسی کی دعا موجب اطمینان نہیں ہوسکتی اور جس کی دعا موجب اطمینان نہ ہو اور جو تزکیہ نہ کر سکے اسے زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایسے لوگوں سے قتال کا اعلان کیا اور جب حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے یہ بات فرمائی کہ آپ ایسے لوگوں سے کیسے قتال کریں گے جو کلمہ گو ہیں؟ تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

> واللّٰه لو منعونی عقالاً کانوا یؤدونه الی رسول اللّٰه صلی الله علیه وسلم لقاتلتهم علی منعه (۲۸)
>
> اگر کسی نے اس رسی کے دینے سے انکار کیا جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتا تھا تو اللہ کی قسم میں اس سے ضرور قتال کروں گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسے موقع پر بظاہر اتنی شدت کیوں اختیار کی، کیا رسی کے بغیر جانوروں کی زکوٰۃ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، یا رسی کے بغیر زکوٰۃ ادا کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے کہ اس سے قتال مؤمن کے لیے جائز ہو جائے، اگر بظاہر دیکھا جائے تو دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہوگا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کی نظر اس سے کہیں زیادہ گہری تھی۔ ان کے نزدیک ہر وہ کام جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انجام دیا جاتا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

۲۸۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ ۱۳۱/۲

سے منع نہیں فرمایا، قانون کی حیثیت رکھتا ہے، قانون پر عمل سے انکار کرنے والے باغی ہوتے ہیں اور باغیوں کی سزا قتل ہی ہے۔ خواہ وہ قانون جس کو توڑا جا رہا ہے یا جس پر عمل سے انکار کیا جا رہا ہے کسی قدر معمولی کیوں نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اعمال حجت و قانون کی حیثیت رکھتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ایک معمول اپنی مسند میں نقل کیا ہے: ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب حج و عمرہ کے لیے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوتے تو جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ کیا تھا، وہاں پڑاؤ کرتے، جس درخت کے سایہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام فرمایا تھا، وہاں آرام کرتے اور جس مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی تھی، وہاں نماز ادا کرتے (۲۹)۔

امام مسلمؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے پوتے بلال بن عبداللہ سے کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت دیتے سنا ہے، پس اگر عورتیں تم سے مسجد میں آنے کی اجازت طلب کریں تو اجازت دے دیں۔ بلال بن عبداللہ نے عرض کیا ہم تو انہیں منع کریں گے۔ حضرت ابن عمرؓ ناراض ہوئے، ان کی ناراضگی کو راوی یوں بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی اس قدر سرزنش کی، ایسے سخت کلمات میں نے کبھی نہیں سنے تھے (۳۰)۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ کی ایک روایت امام ابن ماجہؒ نے نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ سرزمین روم میں کسی جنگ میں شرکت کی، وہاں پر لوگوں کو دیکھا کہ وہ سونے کے ٹکڑے دیناروں کے عوض اور چاندی کے ٹکڑے درہموں کے عوض فروخت کا کاروبار کرتے تھے۔ حضرت عبادہؓ نے تنبیہ کی کہ تم لوگ سود کا کاروبار کر رہے ہو کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "لا تباعوا الذهب بالذهب الا مثلا بمثل لا زيادة بينهما ولا نظرة" (سونے کو سونے کے بدلہ فروخت نہ کرو سوائے اس کے کہ برابر ہو، کوئی زیادتی ہو نہ ادھار)۔

حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ میرے خیال میں سود صرف ادھار کی صورت میں ہوتا ہے، حضرت معاویہؓ کی اس بات پر حضرت عبادہؓ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: "احدثك عن رسول الله صلى الله عليه وسلم و تحدثني عن رايك لئن اخرجني الله لا اسكن بارض لك علي امرة" (۳۱) میں آپ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور آپ میرے سامنے اپنی رائے بیان کر رہے ہیں۔ اگر میں یہاں سے صحیح سالم لوٹا تو اس سرزمین میں ہرگز نہ رہوں گا جہاں میرے اوپر آپ کی حکومت ہو۔

۲۹۔ مسند احمد بن حنبل ۲/۱۳۲

۳۰۔ صحیح مسلم ۱/۳۲

۳۱۔ سنن ابن ماجہ ۱/۸-۹

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی روایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ تشریف فرما تھے اور ان کے پاس ان کا بھتیجا بیٹھا انگوٹھے پر کنکر رکھ کر پھینک رہا تھا۔ حضرت عبداللہؓ نے اس کو منع کیا اور فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ اس سے کوئی شکار نہیں کر سکتا البتہ اس سے کسی کے دانت ٹوٹ سکتے ہیں، یا کسی کی آنکھ پھوٹ سکتی ہے اس بچے نے وہی حرکت دوبارہ کی تو حضرت عبداللہؓ ناراض ہوئے اور فرمایا میں تجھ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کر رہا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور تو پھر وہی حرکت کر رہا ہے۔ میں تجھ سے کبھی بات نہ کروں گا۔ گویا ایک بچہ بھی کوئی ایسی معمولی حرکت کا ارتکاب کرتا ہے کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشادِ گرامی کے خلاف ہے، صحابہ کرامؓ کو اس کا وہ عمل بھی گوارا نہیں اور اس سے ہمیشہ کے انقطاع کی دھمکی دے دی۔ یہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی عظمت تھی۔ صحابہ کرامؓ کے دل میں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسالہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب کی بھی اس قدر عظمت تھی کہ وہ اسے ضائع نہ ہونے دیتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عروۃ بن مسعود الثقفی قریش مکہ کی طرف سے نمائندہ بن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح نامہ کی شرائط طے کرنے آئے تھے۔ علامہ ابن ہشامؒ روایات نقل کرتے ہیں کہ حضرت عروۃؓ نے صحابہ کرامؓ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عجیب تعلق اور عقیدت کا مظاہرہ دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب وضوء فرماتے تو صحابہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسالہ کو لیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تھوکنے کا ارادہ فرماتے تو صحابہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب پر لپکتے اور اگر آپ کی لحیہ مبارکہ سے کوئی بال گرتا تو فوراً اسے لے لیتے۔

حضرت عروۃؓ یہ دیکھ کر واپس مکہ گئے تو قریش کے سامنے اپنے تاثرات یوں بیان کیے: اے گروہ قریش میں نے کسریٰ کو اس کے ملک میں، قیصر کو اس کے ملک روم میں اور نجاشی کو حبشہ میں دیکھا ہے لیکن میں نے کسی بادشاہ کی اس قدر عظمت نہیں دیکھی جیسی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اُن کے صحابہؓ کے دل میں ہے۔ میں نے وہ قوم دیکھی ہے جو ان کو تمہارے سپرد ہرگز نہیں کرے گی اب جو تم رائے رکھو اس کے مطابق فیصلہ کر لو[۳۲]۔

علامہ ابن کثیرؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو آدمیوں نے اپنا تنازع پیش کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جو حق پر تھا۔ دوسرا شخص اس پر راضی نہ ہوا۔ دونوں حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے حضرت ابوبکرؓ نے اس فیصلہ کو بدلنے سے انکار کر دیا۔ یہ دونوں حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آئے اور ان کے سامنے اپنا قضیہ رکھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے مطلع کیا آپؓ نے دوسرے فریق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کی تصدیق کی اور کہا کہ ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں، یہ کہہ کر گھر میں گئے اور تلوار لاکر نہ ماننے والے کا سر قلم کر دیا اور فرمایا کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہو، اس کا فیصلہ عمر کی تلوار کرتی ہے[۳۳]۔

۳۲۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ ۳۳۸/۳

۳۳۔ تفسیر ابن کثیر ۵۲۱/۱

تمام صحابہ کرامؓ کے نزدیک قرآن کریم کی توضیح وتفسیر کے لیے اور مستقل مصدر قانون کی حیثیت سے بھی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین حیثیت حاصل تھی اور اس بات کی تائید خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی بار بار فرما چکے تھے۔ حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا جا رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ سے دریافت کیا تم کس چیز سے فیصلہ کرو گے۔ عرض کیا: قرآن سے۔ پوچھا، اگر قرآن میں نہ ہو، عرض کیا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ دریافت کیا: اگر سنت میں بھی نہ پاؤ، تو عرض کیا: پھر اجتہاد کروں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر حضرت معاذؓ کے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا:

"الحمدللّٰہ الذی وفق رسول رسول اللّٰہ بما یرضیٰ بہ رسول اللّٰہ" (۳۴)

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے [illegible] کو اسی بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہوا۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی اسی بات میں مضمر ہے [illegible] م و مسائل کو سمجھنے اور ان کی بنیاد و اساس کی تلاش میں قرآن حکیم کے بعد سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین درجہ دیا جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ اتباع سنت کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں:

"اتخذ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم خاتما من ذھب فاتخذ الناس خواتیم من ذھب فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انی اتخذت خاتما من ذھب فنبذ و قال ان لن البسہ ابداً فنبذ الناس خواتیم" (۳۵)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ سونے کی انگوٹھی پہنی تو لوگوں نے بھی سونے کی انگوٹھیاں پہن لیں۔ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے سونے کی انگوٹھی لی ہے، اور پھر اسے اتار دیا اور فرمایا کہ آئندہ میں اسے ہرگز نہ پہنوں گا تو تمام لوگوں نے اپنی انگوٹھیاں اتار دیں۔

معلوم ہوا کہ تمام صحابہ کرامؓ کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ جیسا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھتے، خود بھی ویسا ہی کرتے اور جس کسی چیز سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رکتے دیکھتے، خود بھی رک جاتے۔ مدینہ منورہ کی گلیوں میں شراب بہنا اور ایک ہی نماز نصف بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھنا اور نصف کعبۃ اللہ کی طرف کر کے پڑھنا اسی اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بین مثالیں ہیں۔

۳۴۔ سنن ابو داؤد، کتاب الاقضیہ، باب الاجتہاد الرأی فی القضا، ۳۰۳/۳

۳۵۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ، باب اقتداء افعال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۱۹/۹

یہ چند جھلکیاں تھیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ قرآن کے بعد سنت ہی کو سب سے بڑا ماخذ سمجھتے تھے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کی حجیت اور قانونی حیثیت پر قرآن مجید، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور حضرات صحابہ کرامؓ کے آثار کی روشنی میں تفصیلی بحث گذشتہ اوراق میں ہوئی۔ سنت کی حجیت پر دلائل کے سلسلہ میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی عموماً اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصاً عصمت پر بھی بحث کر لی جائے اور اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ قانونِ شریعت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہادات کی نوعیت و حیثیت کیا ہے؟ اس سے سنت کی حجیت اور حیثیت مزید واضح ہو کر سامنے آ جائے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حق تعالیٰ جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَاغَوٰى۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى[النجم ۵۳:۱تا۴]

قسم ہے ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے، یہ تمہارے ساتھی نہ راہ سے بھٹکے ہیں اور نہ غلط راہ ہوئے ہیں اور نہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں، ان کا ارشاد صرف اور صرف وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ستارہ کی قسم کھا کر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ضلال اور غویٰ دونوں سے منزا اور پاک ہیں۔

ضل اور غویٰ میں فرق بیان کرتے ہوئے امام راغبؒ لکھتے ہیں کہ ''ضل'' علم میں غلطی اور گمراہی کو کہتے ہیں اور ''غویٰ'' نیت اور عمل میں غلطی اور گمراہی کو کہتے ہیں [۳۶]۔

کسی شخص کی گمراہی کے یہی دو اسباب ہوتے ہیں کہ یا تو وہ علم کے حصول میں گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کے فہم و ادراک میں غلطی کر دیتا ہے یا علم تو اس نے صحیح حاصل کیا لیکن اس کی نیت، اس کا عمل و کردار صحیح نہیں ہوتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے یہ دونوں باتیں نفی کی جا رہی ہیں کہ گمراہی کسی بھی راستہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں آ سکتی۔ مزید یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر نطق و گویائی کے متعلق شہادت دے دی گئی کہ وہ خواہشات نفسانی کے قریب سے نہیں گذری، اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آ چکی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہادات

اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اجتہادات کی حیثیت اور نوعیت کیا ہے اور کیا

۳۶۔ مفردات، بذیل مادہ

اس میں بھی غلطی اور خطاء کا اس طرح امکان ہے جس طرح ایک امتی کے اجتہاد میں غلطی اور خطاء کا امکان ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے علماء عقائد نے جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب یوں ہے: ''سورۃ الانفال کی اس آیت سے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی جانب سے قریش مکہ کے ان سرداروں سے فدیہ لینے اور آزاد کرنے پر تنبیہ ہوئی جو بدر میں مسلمانوں کی قید میں آئے تھے، علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اجتہاد کرتے ہیں، ان کا یہ اجتہاد وحی خفی ہوتا ہے اگرچہ اس میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے لیکن اولاً یہ غلطی جائز و ناجائز یا حلال و حرام کے درجہ کی نہیں ہوتی بلکہ ایک چیز بہتر ہے اور ایک زیادہ بہتر، حضرات انبیاء سے صرف اس قدر امکان ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے زیادہ بہتر کے بجائے بہتر کے راستہ کو اختیار کرلیں اور ثانیاً یہ کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی جلی آ کر یہ واضح کر دیتی ہے کہ زیادہ بہتر کے مقابلہ میں بہتر راستہ اختیار کرنا آپ کے شایانِ شان نہ تھا۔ انبیاء علیہم السلام کے اس قسم کے عمل کی قانونی حیثیت اس کے باوجود متاثر نہیں ہوتی کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متنبہ کیا گیا ہے۔ مثلاً غزوۂ بدر کے واقعہ میں اگرچہ فدیہ پر متنبہ کیا گیا لیکن فدیہ کا لینا اسی طرح قانون کا حصہ رہا اور اس آیت کے نزول کے بعد بھی عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور ... میں قیدیوں سے فدیہ لیا جاتا رہا۔ جبکہ ایک عام امتی جب اجتہاد کرتا ہے اور اسے بعد میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ اجتہاد صریح نص کے خلاف ہے تو اس پر اس رائے سے رجوع کرنا اور اس پر عمل ترک کرنا واجب ہے۔ اس علم کے بعد وہ اس پر عمل نہیں کر سکتا''(۳۷)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نوعیت کے اجتہاد کی اہمیت کی وجہ یہی ہے کہ ان کی ذات ایک عام مجتہد اور فقیہ سے مختلف ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہادات بھی عام مجتہدین اور فقہاء سے مختلف ہیں۔

سنت اصولِ حدیث کی روشنی میں

ہر دین اور مذہب کا دارومدار اس مذہب کے نبی پر ہوتا ہے اور نبی ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اگر ایک خبر صرف اس وجہ سے قابلِ تردید ہے کہ یہ صرف ایک آدمی نے دی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک ایک نبی نہ بھیجتا بلکہ انبیاء کی جماعتیں ایک وقت میں مبعوث ہوتیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں اس لیے ان کی خبر تنہا معتبر ہے دوسرے لوگوں کی معتبر نہیں ہو سکتی تو کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء کی معصومیت ایک اضافی صفت ہے اور اس صفت کے بعد انبیاء کے کردار کی چھان پھٹک کی ضرورت نہیں رہتی لیکن اگر کسی شخص کے کردار کی چھان بین کر لی جائے اور یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بولتا تو اس کی خبر محض اس وجہ سے رد نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس خبر میں کوئی ساتھی نہیں رکھتا۔

حدیث کی حیثیت کے حوالہ سے سنت کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ احادیث ظنی الثبوت ہیں اور ظن یعنی گمان مصدرِ قانون نہیں بن سکتا۔ یہ بات بے بنیاد ہے کیونکہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقل میں محدثین اور ائمہ اسماء الرجال نے جس حزم

۳۷۔ سیرت المصطفیٰ ۱/۵۵۷-۵۵۸

و احتیاط کا ثبوت دیا ہے اور جس کڑے معیار پر پرکھ کر روایات، راواۃ اور ان کی سندوں کے تسلسل کو دیکھا ہے اگر ان سخت معیارات کے بعد بھی سنت ظنی الثبوت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں پائے جانے والے تمام سائنسی، عمرانی، معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور تاریخی علوم میں کوئی بھی چیز یقین کے درجہ کی نہیں ہے، لہذا ان سب کو طاقِ نسیان کی نذر کر دیا جائے۔

علامہ ابن منظورؒ ظن کے معنی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''الظن الشک و یقین الا انہ لیس بیقین عیان، انما هو یقین تدبر'' (۳۸) ظن کے معنی شک اور یقین کے ہیں، لیکن یہ یقین غور و فکر کے نتیجہ میں حاصل ہوا ہو، آنکھ دیکھے یقین کو ظن نہیں کہتے۔ یعنی ظن کو صرف شک اور گمان کے معنی میں استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ ایسا یقین جو تحقیق، تدبر اور غور و فکر کے بعد حاصل ہو، اسے بھی ظن کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ظن کو محض شک کے معنی تک محدود رکھنا لغت عربی کی رو سے صحیح نہیں۔

اس توضیح کے بعد غور کریں کہ قرآن کریم میں یہ لفظ کن کن معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ظن کا لفظ قرآن میں مختلف اشتقاقات میں ۶۷ مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ بنیادی طور پر ظن کے لفظ کو قرآن نے چار معانی کے لیے استعمال کیا ہے:

۱۔ یقین ۲۔ شک ۳۔ تہمت ۴۔ وہم و گمان (۳۹)

ظن لفظ قرآن کریم میں ان چار معانی میں استعمال ہوا ہے اور سیاق و سباق کے اعتبار سے مفسرین متعین کرتے ہیں کہ یہاں کون سے معنی مراد ہیں۔ لہذا یہ سمجھنا کہ ظن صرف وہم و گمان کے لیے استعمال ہوتا ہے، لغوی اعتبار سے بھی درست نہیں اور قرآن کریم کی تصریحات کی رو سے بھی صحیح نہیں۔ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ کوئی حدیث ظنی الثبوت ہے تو اس کے معنی کیا ہوں گے ثبوتِ سنت کے ذرائع میں ائمہ جرح و تعدیل نے راویوں کے لیے جیسے کڑے اور سخت معیارات رکھے ہیں، ان معیارات کو دینِ اسلام کے امتیازات میں سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔

علامہ ذہبیؒ کی کتاب ''میزان الاعتدال'' کے اسلوب پر غور کریں تو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ علامہ ذہبیؒ نے ہر دور کے محدثین کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے اور یہ طبقات انہوں نے ان محدثین کی ثقاہت کے اعتبار سے قائم کیے ہیں۔ ہر دور کے بہترین محدثین طبقہ اولیٰ میں، دوسرے طبقہ ثانیہ اور ثالثہ میں بیان کیے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ جس کو علامہ ذہبیؒ نے طبقہ اولیٰ میں جگہ دی ہے وہ محدث یقیناً اپنے زمانہ کے بہترین علماء میں سے ہوگا۔

سنت تاریخ تدوینِ حدیث کے آئینہ میں

تاریخ حدیث کے بنیادی مصادر پر سرسری سی نظر ڈالیں تو زمانۂ نبوی میں حسب ذیل تحریری مجموعے نظر آئیں گے:

۳۸۔ لسان العرب، بذیل مادہ ۲۷۲/۴، ۲۷

۳۹۔ تاج العروس، بذیل مادہ ۳۲۷/۹

۱۔ ''کتاب الصدقہ'': حدیث نبوی کا وہ مجموعہ جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اہتمام سے املا کرایا اور اس پر اپنی مہر نبوت بھی ثبت فرمائی۔ امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کتاب الصدقہ'' لکھوائی۔ ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گورنروں کو بھجوائی نہ تھی کہ آپ کا وصال ہوگیا، اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار سے لٹکا دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ ساری زندگی اس پر عمل کرتے رہے اور پھر حضرت عمر فاروقؓ ساری زندگی اس پر عمل پیرا رہے۔ اس میں تحریر تھا کہ پانچ اُونٹ پر ایک بکری واجب ہے[۴۰]۔

۲۔ ''صحیفہ عمرو بن حزمؓ'': سنہ ۱۰ھ میں نجران کا علاقہ فتح ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعبؓ سے ایک مجموعہ حدیث لکھوایا اور حضرت عمرو بن حزمؓ کو نجران کا گورنر بنایا تو ان کو عطا کیا [۴۱]۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امان ناموں، صلح ناموں اور خطوط کے علاوہ اور بھی مجموعات کا پتہ چلتا ہے [۴۲]۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تحریری مجموعہ حدیث کے متعلق علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ ہمارے پاس کریب نے ایک خچر پر لادی جانے والی حضرت ابن عباسؓ کی کتب رکھوائی تھیں [۴۳]۔

۴۔ حضرت علیؓ کے پاس ایک تحریری مجموعہ حدیث تھا جس کے متعلق امام بخاریؒ حضرت علیؓ کا قول نقل کرتے ہیں: ''ہم تمہارے سامنے کتاب اللہ اور اس صحیفہ کے سوا کچھ تلاوت نہیں کریں گے اور اس صحیفہ میں زخموں کی دیت، اونٹوں کے دانت اور مدینہ کے حرم ہونے کے بارہ میں احکام ہیں''[۴۴]۔

۵۔ صحیفہ الصادقہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا وہ مجموعہ حدیث ہے جو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر تحریر کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ سے فرمایا تھا۔

اکتب فو الذی نفسی بیدہ ما خرج منہ الا حق و اشار بیدہ الی فمہ [۴۵]

لکھو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اپنے منہ کی طرف اشارہ فرمایا۔

۴۰۔ جامع ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء فی زکوٰۃ الابل والغنم ۳/۲۰۳ ،
۴۱۔ سنن الدارقطنی ۳/۲۰۹-۲۱۰
۴۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب ''مجموعہ الوثائق السیاسیہ'' میں ان تمام امان ناموں، مراسیل اور معاہدات کو جمع کیا ہے۔
۴۳۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب العرض فی الزکوٰۃ ۲/۱۴۴ و مابعد
۴۴۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب ذمۃ المسلمین ۴/۱۲۲
۴۵۔ المستدرک ۱/۱۰۵

۶۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر روایت حضرت ابوہریرہؓ تک پہنچی تھیں وہ انہیں حفظ تھیں اور تحریر کر لی گئی تھیں[۴۶]۔

۷۔ حضرت انسؓ نے دس سال تک مسلسل دن رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی۔ حضرت انسؓ کے بارے میں ہے کہ وہ اپنی بیاض نکالتے اور کہتے کہ یہ وہ تمام حدیثیں ہیں جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں، انہیں لکھ کر اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا[۴۷]۔

۸۔ حضرت حمید ابن ابی رافعؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ علامہ ابن سعد حضرت حمیدؓ کے متعلق لکھتے ہیں کہ آپ نے حضرت علیؓ سے روایات نقل کی ہیں اور انہیں سیکھا بھی ہے اور قابل اعتماد اور زیادہ حدیثیں نقل کرنے والے راوی ہیں[۴۸]۔

۹۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ (م ۷۴ھ) کا مجموعہ حدیث

۱۰۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ (م ۸۶ھ) کا مجموعہ حدیث

۱۱۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ (م ۷۳ھ) کا مجموعہ حدیث

۱۲۔ حضرت اسماء بنت عمیسؓ (م ۴۰ھ) کا مجموعہ حدیث

۱۳۔ حضرت براء بن عازبؓ (م ۷۲ھ) کا مجموعہ حدیث

۱۴۔ حضرت الدخاک بن قیسؓ (م ۶۵ھ) کا مجموعہ حدیث

۱۵۔ حضرت فاطمہؓ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (م ۱۱ھ) کا مجموعہ حدیث

۱۶۔ حضرت حسن بن علیؓ (م ۵۰ھ) کا مجموعہ حدیث

۱۷۔ حضرت جابر بن سمرۃؓ (م ۷۴ھ) کا مجموعہ حدیث

۱۸۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ (م ۵۰ھ) کا مجموعہ حدیث

۱۹۔ حضرت رافع بن خدیجؓ (م ۷۴ھ) کا مجموعہ حدیث

۲۰۔ حضرت سعد بن عبادۃؓ (م ۱۵ھ) کا مجموعہ حدیث

۲۱۔ حضرت سہل بن سعد الساعدیؓ (م ۹۱ھ) کا مجموعہ حدیث

۲۲۔ حضرت سلمان فارسیؓ (م ۳۵ھ)

۴۶۔ جامع بیان العلم وفضلہ ۱۴۷/۱

۴۷۔ المستدرک کتاب معرفۃ الصحابۃ، باب ذکر انس بن مالک ۵۷۴/۳

۴۸۔ صحیفہ ہمام بن منبہ، مقدمہ ص ۴۷

۲۳۔ حضرت سمرۃ بن جندبؓ (م ۵۹ھ)

۲۴۔ حضرت ابی بن کعبؓ (م ۲۴ھ)

۲۵۔ حضرت اسید بن حضیرؓ (م ۲۰ھ)

۲۶۔ حضرت زید بن ارقمؓ (م ۶۶ھ)

۲۷۔ حضرت زید بن ثابتؓ (م ۴۵ھ)

۲۸۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ (۳۲ھ)

۲۹۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ (۷۳ھ)

۳۰۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ (لوگوں کی فرمائش پر وقتاً فوقتاً حدیثیں لکھوا کر بھیجتی تھیں (۲۹)۔

تابعین کے عہد میں سنہ ۱۹۰ھ تک مزید ۱۵ مجموعہ ہائے حدیث تحریر کیے جا چکے تھے۔ ان مجموعات کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ ۲۵۰ برس تک حدیثیں لکھی نہیں گئی تھیں، غلط ہے اور محض حافظہ و یاد ہی پر کچھ دارومدار نہیں، صحابہ کرام کے دلوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک اور آپ کی سنت کی جو عظمت و حرمت تھی اور صحابہ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پیروی کا جس درجہ اہتمام کرتے تھے، اس کی تفصیلات گذر چکی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

۲۹۔ تہذیب التہذیب ۸/۳۵۵۔ التاریخ الکبیر ۳/۱۶۶۔ صحیفہ ہمام بن منبہ ص ۲۰

Studies in Early Hadith Literature p.43-60

اہم نکات

۱۔ ایمان باللہ کی تکمیل ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے۔

۲۔ ایمان اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فیصلہ، حکم، قول اور فعل کی اطاعت اور اس پر عمل کے لیے برضا و رغبت اور بلا شک و تردد سر تسلیم خم نہ کرلیا جائے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و پیروی ہے۔

۴۔ قرآن مجید کی آیت وَمَايَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوْحٰى [النجم ۵۳:۳،۴] میں "ینطق" سے اللہ تعالیٰ کی وحی نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو مراد ہے۔

۵۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی اور نبوی دونوں حیثیتوں سے واجب اطاعت اور مکمل نمونۂ عمل ہیں۔

۶۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حیثیتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور آپ کی نبوت کی طرح اپنے اپنے اندر دوام و استمرار رکھتی ہیں۔

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو نامکمل مان کر اللہ تعالیٰ کی دو صفات صفتِ علام الغیوب اور صفتِ قدرت میں شک و انکار پیدا کرنا ہے۔

۸۔ جامع ترین کتاب قرآن مجید کی سمجھ کے لیے جامع ترین عقل صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے جامع ترین مأخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت ہے۔

۹۔ نبوی اجتہاد اور غیر نبی کے اجتہاد میں فرق یہ ہے کہ نبوی اجتہاد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کو زیادہ بہتر پہلو سے آگاہ فرما دینے کے باوجود اجتہادِ نبی کی قانونی حیثیت متأثر نہیں ہوتی، جبکہ غیر نبی کو اپنا اجتہاد خلافِ نص معلوم ہونے پر اپنے اجتہاد سے رجوع اور اس پر ترکِ عمل واجب ہوتا ہے۔

کتب برائے مزید مطالعہ

۱۔ حجیت حدیث (اُردو ترجمہ) از مولانا جسٹس تقی عثمانی ادارہ اسلامیات، لاہور

۲۔ سنت کی آئینی حیثیت از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور

۳۔ سیرت خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم از جسٹس پیر کرم شاہؒ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

۴۔ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر از محمد تقی امینی، اسلامک پبلی کیشن لمیٹڈ، لاہور

۵۔ حجیت حدیث از محمد ادریس کاندہلوی، ایم ثناء اللہ، لاہور

۶۔ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریعی مقام از ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، مترجم پروفیسر غلام احمد حریری، ملک سنز، کارخانہ بازار، فیصل آباد۔

مصادر و مراجع

۱۔ قرآن مجید

۲۔ ابن کثیر، اسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، لاہور ۱۹۷۳ء

۳۔ آلوسی، سید محمود، روح المعانی، داراحیاء، بیروت

۴۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، دار احیاء، بیروت

۵۔ مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، دارالمعرفۃ، بیروت

۶۔ احمد بن حنبل، الامام، مسند الامام احمد بن حنبل، المکتب الاسلامی، بیروت

۷۔ ابن ماجہ، محمد بن یزید قزوینی، سنن، دار احیاء، بیروت

۸۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ، جامع ترمذی، نشر السنہ، ملتان

۹۔ دارقطنی، علی بن عمر، سنن الدارقطنی، دارالمحاسن، قاہرۃ

۱۰۔ حاکم نیشاپوری، محمد بن عبداللہ، المستدرک، دائرہ معارف، حیدر آباد

۱۱۔ ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، دارالفکر، بیروت

۱۲۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی، فتح الباری شرح صحیح بخاری، لاہور ۱۹۸۱ء

۱۳۔ خطیب تبریزی، ولی الدین، مشکوٰۃ المصابیح، قدیمی کتب خانہ، کراچی

۱۴۔ عثمانی، شبیر احمد، فضل الباری شرح اردو صحیح بخاری، کراچی ۱۹۷۳ء

۱۵۔ ملا علی قاری، علی بن سلطان، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ

۱۶۔ ابن عبدالبر، ابوعمر یوسف قرطبی، جامع بیان العلم وفضلہ، دارالطباعۃ المنیرۃ، مصر

۱۷۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، التاریخ الکبیر، دائرہ معارف، حیدر آباد دکن، ۱۳۶۰ء

۱۸۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی، تہذیب التہذیب، دائرہ معارف، حیدر آباد دکن ۱۳۶۶ھ

۱۹۔ محمد بدر عالم، حجیت حدیث، المطبع الاسلامی، لاہور ۱۹۷۹ء

۲۰۔ محمد ادریس کاندھلوی، حجیت حدیث، ایم ثناء اللہ، لاہور

۲۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ

۲۲۔ محمد ادریس کاندھلوی، مقدمۃ الحدیث (مخطوط)

۲۳۔ محمد عجاج الخطیب، السنۃ قبل التدوین، مکتبۃ وہبۃ، قاہرۃ ۱۹۶۳ء

۲۴۔ محمد ادریس کاندہلوی، مولانا، سیرت المصطفیٰ، مکتبہ عثمانیہ، لاہور ۱۹۹۲ء

۲۵۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ

۲۶۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، صحیفہ ہمام بن منبہ، ملک سنز، فیصل آباد ۱۹۸۲ء

۲۷۔ راغب اصفہانی، ابو القاسم الحسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، دار المعرفۃ، بیروت

۲۸۔ ابن منظور، لسان العرب، بیروت

۲۹۔ زبیدی، تاج العروس

☆☆☆☆☆